www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2022

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

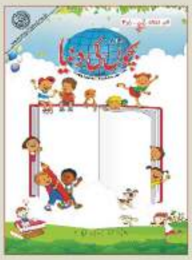

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے    سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| روبرو | انجم قدوائی سے انٹرویو | حقانی القاسمی | 5 |
| شخصیت | امام باندی بیگم عفت عظیم آبادی | سلطان آزاد | 9 |
| نکہت سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 13 |
| جہانِ نسواں | غضنفر کے ناولوں میں احتجاجی رجحانات | ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا | 14 |
| | پکچر گیلری کا مشاہدہ و مطالعہ | ڈاکٹر بی بی رضا خاتون | 19 |
| | جمیلہ بیگم: ایک صاحب دیوان شاعرہ | ڈاکٹر شاہد ساز | 25 |
| | ترنم ریاض بحیثیت شاعرہ | مسعود احمد | 30 |
| | اختر الایمان کی شاعری میں یادوں کی بازیافت | ڈاکٹر معصوم زہرا | 34 |
| | 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں عورت کا بیانیہ | جویریہ خاتون | 39 |
| اعتراف ہنر | نور ظہیر کے افسانوں میں عصری مسائل | ڈاکٹر تسلیم عارف | 43 |
| حسن سخن | سپریا سنگھ 'وینا' / رچنا نرمل، شہناز خاتون | | 47 |
| افسانہ | نیک انسان | ڈاکٹر نشاں زیدی | 49 |
| | پیارا سا ٹھگ | ڈاکٹر خورشید عالم | 52 |
| باورچی خانہ | | | 56 |
| صحت | کھانا پکانے سے متعلق ضروری باتیں | شکیل احمد | 58 |
| آرائش و زیبائش | | | 60 |
| تاثرات | تاثرات نگر نگر سے | | 62 |



آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:6 شمارہ: 12 دسمبر 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

# مشعل

عالمی وبا کے آنے کے بعد ہمارے احساسات اور جذبات پوری طرح تبدیل ہو چکے ہیں۔اس دوران ہم نے بہت سے دلدوز مناظر کا بھی سامنا کیا۔گزشتہ دو تین سالوں میں ہمارے درمیان سے بہت سی عظیم شخصیتیں ہم سے رخصت ہو چکی ہیں اور اپنے پیچھے ایسا خلا چھوڑ گئیں جن کا پر کرنا آسان نہیں۔ان عظیم شخصیات میں صحافی بھی تھیں، فکشن نگار بھی، شاعرہ بھی اور محقق و نقاد بھی۔ خواتین میں فاطمہ پروین، شمشاد جلیل، ترنم ریاض، سعدیہ دہلوی، تبسم فاطمہ وغیرہ وہ نام ہیں جنھوں نے ادب کی بے لوث خدمت کی۔یہ تمام شخصیات اپنے آپ میں ایک کہکشاں تھیں۔انھوں نے زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے وسیع مطالعے سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ان تمام شخصیات نے جس طرح اردو ادب کی خدمت کی وہ اردو زبان و ادب کے تحفظ اور اس کے تئیں عقیدت کو ظاہر کرتا ہے۔ان شخصیات کے جانے سے یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ ان کے کارناموں کا تحفظ کیسے کیا جائے۔ان شخصیات کا تعلق جس زبان سے تھا اس زبان میں کیسے دلچسپی پیدا کی جائے تا کہ زبان کا تحفظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم اس زبان کو بھی زندہ رکھ سکیں۔اردو زبان سے ہم اپنے بچوں کو روشناس کرائیں تا کہ وہ آگے چل کر اس زبان کو اپنا کر اپنے اسلاف کے کارناموں کو آگے بڑھا سکیں۔جن لوگوں کی مادری زبان ہندی یا اردو ہے وہ بہ آسانی اس زبان کو اور بہتر کر سکتے ہیں۔وہ اس میں نمایاں کارنامے انجام دے سکتے ہیں اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اردو زبان کو اپنا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ جب تک ہم اپنے بزرگوں کی تصانیف سے اپنے بچوں کا رشتہ نہیں جوڑیں گے تب تک ہم اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتے۔اپنے بچوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے روبہ رو کرانا ہماری ذمہ داری ہے۔اس کے لیے ہمیں افراد سازی کے عمل کو اپنانا ہوگا تا کہ ہمارے بچے اپنے بزرگوں اور اپنی زبان کے تحفظ کو یقینی بنا سکیں۔ہمیں نئی نسل میں زبانوں کے تئیں نئے جذبے کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ہمیں اردو کی ترویج و اشاعت پر غور کرنا ہوگا اور بزرگوں و پیش رووں کی تصانیف سے نئی نسل کو روبہ رو کرانا ہوگا۔ریاستی اور دیہی سطح پر ایسی بہت سی انجمنیں ہیں جو فروغ اردو کے لیے کوشاں ہیں اور اس کے لیے دن رات محنت کرتی ہیں۔ایسی انجمنوں کی ستائش کی جانی چاہیے اور ان کی خدمات کا اعتراف وقتاً فوقتاً کیا جانا چاہیے۔اردو کا فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے،ہمیں خود بھی اس کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔نئی نسل میں اردو زبان و ادب کے تئیں بیداری پیدا کرنی ہوگی تا کہ وہ بھی آگے چل کر ادب میں نمایاں کارنامے انجام دے سکیں۔ہمیں نئی نسل کو اردو کی خدمت کے لیے تیار کرنا چاہیے تا کہ ان میں اردو زبان و ادب کے تئیں جوش و جذبہ اور لگاؤ کو بیدار کیا جا سکے اور جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پر کیا جا سکے۔اس سلسلے میں قومی اردو کونسل کی اہم پیش رفت بچوں کے لیے بچوں کی دنیا رسالہ شائع کرنا ہے۔ساتھ ہی 'بچوں کے ادب' کے تحت کونسل بچوں کے لیے دلچسپ و جاذب نظر تصاویر کے ساتھ سائنسی و دوسری معلوماتی کتابیں بھی شائع کرتی ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

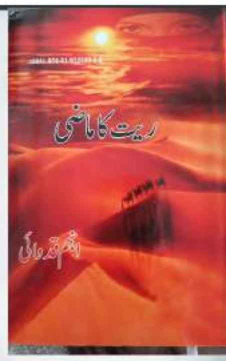

حقانی القاسمی

# ’’عورتوں کی لڑائی مردوں سے نہیں بلکہ معاشرے کی ذہنیت سے ہے‘‘

# انجم قدوائی

سماجی تاریخ میں عورتوں کی معاشرتی حیثیت، مقام و مرتبت کے تعلق سے بہت سے اشارے اور حوالے موجود ہیں ۔ ایک دور تھا جب عورت مرد سے بالا تر تھی اور حسب نسب اور وراثت کے سلسلے ماں کی طرف منسوب ہوا کرتے تھے۔ امہاتی نظام رائج تھا ۔ عورت طاقت اور زرخیزی کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ عورت کی وجودی حیثیت تبدیل ہوتی گئی اور وہ مرد کی خواہشات اور مفادات کا تابع مہمل بن گئی ۔ دو وجود کی ایک ایسی جنگ شروع ہوگئی جس کا اختتام شائد ہی ممکن ہو۔ عورت مرد کی اس جنگ نے بہت سے تضادات اور تناقضات کو بھی جنم دیا جس کی وجہ سے عورت کی وجودی حیثیت کا صحیح ادراک مشکل ہوگیا۔ معاشرتی نظریہ اور تصور کی تبدیلی کی وجہ سے عورت ثانوی وجود بن گئی ۔ ہندوستان میں بھی ایک زمانہ میں مادرانہ نظام قائم تھا۔ دیویاں پوجی جاتی تھیں مگر بعد میں یہ بھی ہوا کہ عورتوں کو اگنی پریکشا سے بھی گزرنا پڑا۔ انگریزوں کا احسان ہے کہ بہت سی عورتیں زیور تعلیم سے آراستہ ہونے لگیں ورنہ ان کے حقوق و اختیارات بھی سلب ہوتے رہتے ۔عورتیں کنیز بنتیں یا حرم سراؤں کی زینت مگر تعلیم کی روشنی پھیلی تو عورتوں کو اپنی ذات، وجود اور حیثیت کا علم ہوا۔ عورتوں نے اپنے حقوق کی جنگ شروع کر دی اور مردوں کی دنیا میں اپنی کامرانی کا پرچم لہرانے لگیں۔ مساوی حقوق اور مواقع کی بات کرنے لگیں۔ گو مکمل طور پر یکساں حقوق اور مواقع نہ ملے مگر امکانات کے بہت سے دروازے ضرور کھل گئے۔ خواتین نے اس مفروضے کو بھی مسترد کیا کہ عورتیں جسمانی اور فکری طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے اندر بے پناہ قوت اور توانائی ہوتی ہے تبھی تو شاعر رومان اختر شیرانی نے کہا تھا

وہ چاہے تو الٹ دے پردہ دنیائے فانی کو
وہ چاہے تو مٹا دے جوش بحر زندگانی کو
وہ چاہے تو جلا دے نخل زار حکمرانی کو
وہ چاہے تو بدل دے رنگ بزم آسمانی کو
وہ کہہ دے تو بہار جلوہ مٹ جائے نظاروں سے
وہ کہہ دے تو لباس نور چھن جائے ستاروں سے

یہ سچ ہے کہ عورت اور مرد کے مابین حیاتیاتی ،نفسیاتی اور جذباتی فرق ہے اور افکار و اقدار میں بھی اختلاف ہے مگر اس کی بنیاد پر عورتوں

کے ساتھ امتیازی سلوک کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے مرد معاشرے سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے بھی صنفی تعصب اور تفریق کے بجائے معاشرتی ترتیب اور توازن پر زور دیا۔ محکومیت کا محضر نامہ چھین کر نفسیاتی طور پر عورتوں کو مستحکم، مضبوط اور با اختیار بنایا۔ ان کے اندر خود آگہی پیدا کی۔ آج اسی وجہ سے خواتین کے تعلق سے صورت حال قدرے بہتر ہے۔ مرد معاشرے کو علامہ اقبال نے بھی یہ احساس دلایا کہ:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

کرشن چندر کے نثری قصیدوں نے بھی مردانہ ذہنیت بدلی انھوں نے کہا کہ ''عورت دھرتی ہے، وہ زندگی کا منبع ہے، وہ زندگی کی منزل ہے، وہ خود تاریکی میں رہتی ہے لیکن اس کی تاریکی سے ان درخشاں موتیوں کو پیدا کرتی ہے جنھیں لوگ رام اور لکشمن کہتے ہیں''

ٹامس ہاڈی نے سچ ہی کہا تھا کہ ''عورت گھر کی زینت ہی نہیں بلکہ گھر کی روح ہے''

عورت قدرت کا زریں انعام ہے اور بہترین نعمت ہے وہ بدی یا دوزخ کا دروازہ نہیں، جنت کی کنجی ہے۔

آج مرد معاشرے کی ذہنیت مکمل طور پر تبدیل نہ ہوئی ہو مگر معیشت میں عورت کی شمولیت اور مختلف شعبہ حیات میں ان کی با اختیاری سے صورت حال بہت حد تک بدل گئی ہے۔ اور یہ احساس مرد معاشرے کو ہونے لگا ہے کہ زندگی میں سارے رنگ عورتوں ہی سے ہیں یہ رنگ ختم ہو گئے تو کائنات کی خوبصورتی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انجم قدوائی نے عورتوں کے جذباتی ذہنی، فکری اور دیگر مسائل کے حوالے سے مثبت گفتگو کی ہے کہ انھیں معاشرتی تضادات اور نسائی نفسیات کا ادراک ہے۔ انھیں عورتوں کی حساسیت اور جذباتی کیفیت کا بھی علم ہے ان کے ذہن میں ماضی کا نقش بھی ہے اور حال کا عکس بھی۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ ان کی ایک بہن شمع ظفر زیدی اردو کی بہترین شاعر اور چھوٹی بہن غزال ضیغم معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے شریک حیات مشہور ادیب و افسانہ نگار مصاعد قدوائی جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر ہیں۔ انجم قدوائی کو کم عمری سے ہی شعر و ادب کا ذوق و شوق تھا۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے آنرز (تاریخ) کیا ہے۔ ان کی پہلی کہانی رسالہ 'کھلونا' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مختلف اخبارات و رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا دو مجموعے 'ریت کا ماضی' اور 'بس اک نقطہ' شائع ہو چکے ہیں۔ انجم قدوائی نظمیں بھی لکھتی ہیں اور رسائل میں یہ نظمیں شائع بھی ہوتی رہی ہیں۔ ان کا آبائی وطن سلطان پور کا گاؤں بہار پور ہے مگر ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ پیش ہیں انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

**س**۔ کیا آپ gender discrimation پر یقین رکھتی ہیں؟

**ج**۔ جنڈر ہی نہیں میرے حساب سے کسی بھی طرح کا فرق کرنا کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں ہے۔ میں اس لفظ ڈس کریمینیشن پر یقین نہیں رکھتی۔

**س**۔ کیا binary gender system کو ختم کیا جانا ممکن ہے؟

**ج**: میرے خیال سے ناممکن ہے۔ بنرے جنڈر سسٹم آج کا نہیں ہے بلکہ جب سے تاریخ لکھی گئی ہے تب سے موجود ہے۔ ہوسکتا ہے دھیرے دھیرے لوگ چیزوں کو اپنانا شروع کر دیں لیکن ابھی بھی ان کے ذہن کے کسی کونے میں یہی بات رہتی ہے کہ جنڈر بیس دو ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ جو بھی لوگ ہوتے ہیں وہ ابنارمل ہوتے ہیں۔ یا ان میں کوئی، خرابی، غلطی یا کمی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو پوری طرح سے ختم کرنا ناممکن لگتا ہے۔

**س**۔ توانائی کے تمام مراکز پہ کنٹرول کے باوجود عورت کمزور کیوں کہلاتی ہے؟

**ج**: کوئی بھی دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے، مردوں میں بھی اگر دیکھا جائے تو دو مرد ایک جیسے طاقتور نہیں ہو سکتے۔ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے کوئی بھی دو لوگ بالکل ایک جیسے نہیں ہیں۔ لیکن اتنے برسوں جس طرح عورتوں کو دبا کر رکھا گیا اسکی وجہ سے کئی عورتوں کو اپنی طاقت کا اندازہ خود بھی نہیں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ذہنی اعتبار سے عورتیں کمزور ہیں۔ ورنہ علم کے ہر شعبے میں عورتیں آگے آگے نہیں ہوتیں، وہ تعلیم کا میدان ہو، حکومت ہو یا تجارت ہر جگہ خواتین نے کامیابی حاصل کی ہے اور کر رہی ہیں۔ مشکل اوقات میں اکثر خواتین کا ذہن زیادہ ایکٹو رہتا ہے بہ نسبت مردوں کے۔ پریشانی کے وقت عام طور سے مردوں کو سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے جسمانی اعتبار سے خواتین کو کمزور ثابت کرتے کرتے مردوں نے اسے کمزور بنا دیا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہ تخلیق کا کرب وہی محسوس کر سکتی ہیں۔ یہ کام مردوں کو نہیں سونپا گیا۔ یہ کرب جو عورتوں کے حصے میں آیا یہ مرد کبھی برداشت نہیں کر سکتے اور یہ بات ایک سائنٹفک اسٹڈی کے مطابق ہے۔

**س**: مسلم معاشرے کی خواتین تعلیم' صحت اور انصاف کے باب میں دوسروں سے پچھڑی ہوئی کیوں ہیں؟

**ج**۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ بات مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسرے مذاہب میں بھی عورتیں تعلیم کے لحاظ سے کہاں تک پہنچی ہیں یا ہمارے مذہب میں پچھڑی ہوئی ہیں۔ یہ بات معاشی حالات اور رہن سہن سے تعلق رکھتی ہے۔ اکثر مسلمان طبقے کے لوگ وسائل کی کمی ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھتے ہیں اور صرف لڑکوں کو اسکول بھیجتے ہیں۔ اوراس سے آگے کی بات انصاف اور صحت کی ہے یعنی جب تعلیم نہیں ہوگی تو اپنی صحت کا خیال بھی نہیں رکھ سکیں گی اور اپنے حقوق کے لیے انصاف مانگنا تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ صرف مسلم خواتین کے لیے نہیں کہہ سکتے بہت سی ہندو خواتین بھی اس بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔

**س:** فیمنزم سے عورتوں کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان؟

**ج:** کسی دور میں نئے خیالات و جذبات اپنی جگہ بناتے ہیں تو وہاں پر فائدہ اور نقصان بھی ہمیشہ ساتھ ساتھ پنپ رہے ہوتے ہیں۔ اگر ایک عورت اپنے معاشرے میں خود کو محفوظ اور مساوی حقوق دینے کے لحاظ سے بات کرے تو صورتِ حال نہ صرف جائز ہے بلکہ سودمند بھی ہے مگر وہی عورت خود کو معاشرتی ناانصافیوں کی بھینٹ چڑھتا دیکھ کر انتہا پسندی کی روش اختیار کرلے تو وہ اپنے آپ کو فیمنزم سے جوڑتی ہے مگر حقیقتاً وہ اس کے برعکس بات کر رہی ہے۔ جہاں فیمنزم نے فائدہ دیا وہاں نقصان کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ اگر صرف اپنی بات رکھنے کا راستہ ہے تو یقیناً فائدہ مند ہے عام طور سے لوگ اس لفظ کا مطلب سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں پر فوقیت دینا تو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اس لفظ فیمنزم کا مطلب ہم آہنگی ہے۔ ایک ایسی سوسائیٹی جہاں دونوں کی کی اہمیت برابر ہو۔ فیمنزم کا مطلب عورتوں کو زیادہ اہمیت دینا ہرگز نہیں ہے۔

**س:** کیا مرد کے بغیر عورت کے وجود کو مکمل مانتی ہیں؟

**ج:** ہر انسان کا اپنا وجود ہوتا ہے مرد یا عورت اپنے وجود کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔

**س:** کیا یہ سچ نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں رام موہن رائے اور ودیاساگر کی اصلاحی تحریکوں کے بعد ہی فیمنزم کو آواز ملی؟

**ج:** یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے کا فیمنزم لانے میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور پھر آزادی کے دوران بھی جس طرح عورتوں کو لڑائی میں شامل کیا گیا تھا، اس بات سے بھی فیمنزم کو کافی بڑھاوا ملا۔

**س:** کیا وومین امپاورمنٹ کی آڑ میں مردوں کو مفلوج بنایا جارہا ہے؟

**ج:** بالکل بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ جب تک عورتیں چار دیواری میں محدود تھیں تب تک کسی کو پریشانی نہیں تھی لیکن اب جبکہ وہ اپنا حق مانگ رہی ہیں تو مردوں کو خطرہ ہو رہا ہے؟ عورتوں کی لڑائی مردوں سے نہیں بلکہ معاشرے کی ذہنیت سے ہے۔ خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ جب عورتوں کو برابر کے مواقع اور انصاف ملے گا تو انکو بھی اپنا وجود ملے گا۔ فیمینزم کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مردوں کو پیچھے ہٹانا ہے، بلکہ عورتوں کو آگے بڑھنا ہے اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔

**س:** کیا عورتوں کے objectification پر عورتوں نے سنجیدگی سے احتجاج یا مظاہرہ کیا ہے

**ج:** نہیں، لیکن شاید اب شروعات ہو سکے۔ عورتوں کو ہمیشہ سے ہی پاکیزگی کا دوسرا روپ مانا گیا ہے۔ عورتوں سے کبھی بھی کسی بری یا غلط بات کی

امید نہیں ہوتی اگر وہ کوئی غلط قدم اٹھالیں تو انکے گھر والے ہی انکا جینا حرام کر دینے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ جبکہ اگر لڑکے کچھ غلط کام کریں یا برائی میں پڑ جائیں تو اس بات کو ٹال دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مرد ہیں۔

ایسا کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں ہیں یا پھر وہ دنیا میں برائی پھیلانے ہی آئے ہیں۔

انصاف سے ایک جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا؟ وہ عورت ہوں یا مرد۔ مثلاً اگر عورتیں سگریٹ پیئیں تو بہت بگڑی ہوئی آوارہ تصوّر کی جاتی ہیں لیکن مرد حضرات آرام سے کش پہ کش لگاتے جارہے ہیں۔ اگر یہ بری عادت ہے تو دونوں کے لیے کیوں نہیں ہے؟ قصوروار صرف ایک ہی کیوں؟

**س:** عورت خود ہی commercial proposition بننے کے لیے بیتاب ہو تو پھر مرد معاشرہ پہ الزام کیوں؟

**ج:** میرے حساب سے نہیں۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو بیوٹی کنٹسٹ کو دنیا بھر میں اتنی شہرت نہ ملتی۔ ٹی۔وی پر اتنے سارے اشتہار اور فلمیں ہیں جن میں خوبصورتی کو بڑھاوا دیا گیا اور جس میں عورتیں خود حصے دار ہیں۔ صرف اس لیے کہ انکو مالی فائدہ ہوتا ہے۔ لوگ وجہ۔۔کو چھوڑ کر پیسے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں چاہے وہ عورت ہو یا مرد۔

**س:** کچھ خواتین کا کہنا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں ان کا زیادہ استحصال کرتی ہیں؟

**ج:** ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی چیز برسوں سے برداشت کی جائے اور اس سے فائدہ نہ ہو تو لگتا ہے کہ ہمکو بھی دوسروں کی طرح ہی ہو جانا چاہیے۔ لیکن غم اس بات کا ہے کہ عورت خود دوسری عورت پر ظلم کرتی ہے اور اس طرح ہر عورت کسی نہ کسی ظلم سے لڑ رہی ہے۔

**س:** وِش کنیا کے بارے میں سنا ہے کیا وِش پرش بھی ہوتا ہے؟

**ج:** وِش کنیا تو کتابی باتیں ہیں۔ "لہو کے پھول" میں حیات اللہ انصاری نے بھی وِش کنیا کا ذکر کیا ہے۔ مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اسکا کوئی وجود نہیں جسطرح پریاں یا مافوق الفطرت چیزیں جن سے انسان کو ڈرایا جاتا رہا ہے اسی میں ایک چیز یہ بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی مصنف نے وِش پرش کی بات بھی کی ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا۔

**س:** زر زمین کے ساتھ زن کو فساد کی جڑ کیوں کہا جاتا ہے؟

**ج:** عورتوں کو کمتر بنانے کی ہر طرح کوشش کی گئی ہے ہوسکتا ہے کہ یہ بات بھی اسی میں سے ایک ہو۔ مردوں کو یہ بتانے کے لیے کہ عورت انکی بربادی کا سبب بن سکتی ہے اور اس سے انکو ناقابل تلافی ،نقصان ہوسکتا ہے اس لیئے یہ بات کہی گئی ہے۔ ورنہ کیا مردوں کی وجہ سے لڑائیاں نہیں ہوتیں۔؟

**س:** بہو کے ساتھ ساس کا ظالمانہ رویہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے؟

**ج:** الگ الگ خاندانوں کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ پیسوں یا جہیز کے متعلق، اولاد ہونا یا نہ ہونا، عزّت ملنا یا نہ ملنا، سکون نہ ملنا اور اسکی ذمہ دار بھی ہر گھر میں کبھی عورت اور کبھی مرد ہوتا ہے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک جنڈر کی وجہ سے ہی یہ ساری پریشانیاں آتی ہیں۔

**س:** کامیاب بیویوں سے مرد کیوں خائف رہتے ہیں؟

**ج:** جو مرد اپنی عزتِ نفس اور خود پر انحصار کرنے والا ہوتا ہے اپنے آپ پر یقین اور پھر مرد حضرات ان کو اپنی بیویوں کی کامیابی پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ جن مردوں میں یہ ساری خوبیاں نہیں ہوتیں وہ عورت کی کامیابی اپنی آن پر لے جاتے ہیں اور جنڈر ڈس کرمینیشن شروع ہو جاتا ہے۔

**س:** عورتوں میں ایک دوسرے کے لئے زیادہ حسد ہوتا ہے؟

**ج:** ایسا نہیں ہے۔ یہ بات شاید اس لیے کہی گئی کیونکہ عورتیں اپنے جذبات ظاہر کر دیتی ہیں۔ یا دوسرے لوگوں سے اپنی باتیں شیئر کر لیتی ہیں۔ لیکن مرد نہ اپنے جذبات ظاہر ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے دل کی باتیں زیادہ لوگوں سے یا بیوی سے شیئر کرتے ہیں۔ حسد ایک احساس کا نام ہے جو ہر انسان کے اندر پایا جاسکتا ہے۔ اس میں عورت مرد کا کوئی فرق نہیں۔

**س:** مرد عورت پر اعتبار کرے تو کیسے کہ اس کے سامنے راجہ بھرتری ہری کی رانی پنگلہ کی مثال موجود ہے؟

**ج:** اس طرح تو ہمارے پاس شکونی ماما اور کنس ماما جیسی مثالیں بھی ہیں تو کیا لوگوں نے اپنے ماموں پر یقین کرنا چھوڑ دیا؟ یا پھر ہابیل اور قابیل جیسی مثال بھی موجود ہے تو کیا لوگوں نے اپنے بھائیوں پر یقین رکھنا چھوڑ دیا؟ یہ ساری باتیں جہالت پھیلاتی ہیں اور کچھ نہیں۔

**س:** کیا بدنامی کے ڈر سے عورتیں چپ رہنا پسند کرتی ہیں؟

**ج:** بے شک اس معاشرے نے عورت کو بدنام کرنے کے بے شمار طریقے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ عورت کے اٹھنے بیٹھنے سے لیکر اسکے لباس، اس کے چلنے کا طریقہ گھر آنے جانے کا طریقہ یہاں تک کہ کھانے پینے کو لے کر بھی ہر چیز میں بدنام کیا جاسکتا ہے۔ عورتیں اسی لیے خاموش ہو جاتی ہیں کہ انکو ہزاروں سوالوں کے جواب نہ دینے پڑ جائیں۔

□□□

Cell:9891726444

haqqanialqasmi@gmail.com

شخصیت

سلطان آزاد

# امام باندی بیگم عفت عظیم آبادی

ہندوستان کے زمیندارانہ نظام میں لاکھوں زمیندار، نوابین اور رؤسا ہوئے جنہیں دولت وثروت اور اقتدار ملے۔ان میں کئی شخصیتیں ایسی ہیں جن کو اپنے سماجی وثقافتی، تمدنی اور علم وادب کی ہنرمندی کے باعث ان کے اسمائے گرامی تاریخوں اور کتابوں میں درج ہیں لیکن بہتیرے ارباب اقتدار، زمیندار اور رؤسا صرف اپنے عیش وعشرت میں ڈوبے رہے اور اپنے اقتدار اور طاقت کا بے جا استعمال کرکے گزر گئے۔ ان کے نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔لیکن جن شخصیتوں نے اپنے دورِاقتدار میں دولت وثروت کا صحیح استعمال سماج کی فلاح وبہبود میں صَرف کیا ان کے کارنامے زندہ جاوید ہوگئے۔ایسے اکابرین کی تاریخ آج بھی شہادت دیتی ہے کہ ان کے فلاحی کارنامے اور ہنرمندی، علم پروری نہ صرف لائق تحسین ہیں بلکہ آج بھی لوگ اُن سے بہرہ منداور مستفیض ہورہے ہیں۔ ان چند عظیم شخصیتوں اور اکابرین میں ایک باوقار اہم شخصیت کا نام امام باندی بیگم ہے۔

امام باندی بیگم کے خاندانی حسب ونسب اس طرح ہے:

’’عالم گیر بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں جب سربلند خاں، عظیم آباد کے صوبہ دار بنائے گئے تو انھوں نے اپنا نائب شیخ عبداللہ کو غازی پور، یوپی میں مقرر کیا اور منتخب صوبیدار سربلند خاں نے محلّہ کٹرہ اختیار میں ایک مکان ۱۷۰۷ء میں تعمیر کرایا اور اس جگہ کا نام گلزار باغ رکھا جو گلزار باغ وقف اسٹیٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ کا سلسلہ نسب شیخ عبداللہ ناظم غازی پور سے ملتا ہے ان کے تیسرے فرزند نواب سعداللہ خاں تھے اور موصوف کے ایک فرزند نواب علی اعظم خاں کے نام سے تھے۔آپ کی ایک بیٹی بجی بیگم کے نام سے تھیں۔ بجی بیگم کی بیٹی وحیدالنساء تھیں، جن کی شادی میر سعادت علی سے ہوئی تھی۔ان ہی کی بیٹی امام باندی بیگم جو اپنے چار بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ان کے بھائیوں کے نام یہ ہیں:’’میر محمد، میر علی، میر حسن، میر حسین۔‘‘

(بحوالہ:مختصر تاریخ۔وقف اسٹیٹ گلزار باغ، پٹنہ از مولانا سید اسد رضا، اشاعت ندارد)

امام باندی بیگم صاحبہ کے مورث اعلیٰ نواب فضل علی خاں صوبہ بہار کے نائب اور غازی پور کے ناظم تھے۔صوبہ بہار کے شہر عظیم آباد میں ان کی جاگیر کا نام گلزار باغ تھا۔ان کی تاریخ پیدائش 1829 ہے۔ان کے شوہر نواب سعادت علی خاں، جو پیراکی میں ایسے یگانہ روزگار تھے کہ تیرتے ہوئے گنگا پار کر جاتے تھے۔ایک بار گنگا ندی میں تیرتے وقت ’مگر‘ نے ان کا پاؤں پکڑلیا اور ان کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ یہ حادثہ 1255ھ میں ہوا تھا۔نواب سعادت علی خاں پیراکی کے علاوہ شعروسخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ تمکین ان کا تخلص تھا۔ یہ نورالحسن خاں کے صاحبزادے تھے۔نواب سعادت علی خاں تمکین کے دواشعار ملاحظہ ہوں۔

گر نشہ ہے یہی نگہ میں تیری
مئے کے پینے کی احتیاج نہیں

نام تمکین ہوا تو کیا ہمدم
رات دن بیقرار رہتا ہوں

(بحوالہ: ریختہ فاؤنڈیشن، بتاریخ ہشتم، صفر، روز شنبہ، ۱۲۵۵ھ)

1255ھ میں جوان کے شوہر کے ساتھ حادثہ ہوا۔ اس وقت امام باندی بیگم کی عمر صرف اٹھائیس (28) سال تھی۔ اولاد میں صرف ایک بیٹا واجد علی خاں تھے جو کمسنی میں فوت ہو گئے۔ روایت ہے کہ امام باندی بیگم شوہر اور بیٹے کی موت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے سارا علاقہ اور جائداد وقف کر دی اور اپنے بھتیجوں کو متولی قرار دیا۔ وقف کا سال 1890 ہے۔

ان کی موقوفہ جائداد اور ان کے حسن وسلوک کے متعلق مولانا سید اسد رضا صاحب اور مشہور مورخ فصیح الدین بلخی کتاب "تذکرہ نسوان ہند" مطبوعہ 1956 کی روایتیں بالترتیب درج ہیں:

"......وہ اس وقف کی خود متولیہ اور منتظمہ تھیں، بلکہ تاریخ کی وہ ممتاز خواتین جو دیندار اور مخیرّہ مانی جاتی ہیں ان میں بیگم صاحبہ کا نام بھی شامل ہے۔ آپ بڑی باہمت اور پختہ عزائم کی مالکہ تھیں۔ ایک واقعہ تاریخ میں آج بھی سنہرے حرفوں میں تحریر ہے، موصوفہ بڑی جائداد کی مالکہ تھیں۔ زراعت کی زمین بھی کافی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی (80) ہزار بیگھہ کی مالکہ تھیں۔ رعایا کو زراعت کے لیے پانی کی سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔ سب نے مل کر احتجاج کیا۔ فوراً ہی آپ نے نہر کے کھودنے کا حکم دیا۔"

(بحوالہ مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ، گلزار باغ، پٹنہ از مولانا سید اسد رضا، اشاعت ندارد)

"......بہار شریف اور خسرو پور کے درمیان ایک موضع میں اپنی ذاتی نگرانی میں پانچ ہزار بیلداروں کو لے کر ایک رات میں ایک میل کے قریب لانبی نہر کھدوادی اور اس کے صلہ میں بیلداروں کو بیس ہزار روپے انعام دیئے۔ بعد میں مخالف زمینداروں نے مقدمہ دائر کیا اور مقدمہ پری وی کونسل تک پہنچا تو ججوں نے باور نہ کی کہ ایک پردہ نشیں عورت نے ذاتی نگرانی میں اتنی بڑی نہر رات بھر میں کھدوائی ہوگی۔ بیگم صاحبہ مذہب تشیع میں بڑی راسخ الاعتقاد تھیں لیکن ان کے عقیدہ میں تعصب کو دخل نہ تھا۔ نہر کے مقدمہ کے دوران میں انھوں نے فریق ثانی کے منیجر اور منتظم کو جو سنی المذہب تھے، پیام دیا کہ وہ اگر ان کی طرفداری کریں تو ایک لاکھ روپیہ صلہ دیا جائے گا۔ منتظم نے جواب دیا کہ بیشک یہ رقم تو اتنی ہے کہ پشت ہا پشت کے لیے اسائش کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ لیکن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ میں نمک حرامی اور بددیانتی نہیں کر سکتا۔ مقدمہ کے انفصال کے بعد یہ منتظم کنارہ کش ہو کر گوشہ عزلت میں بسر کرتا تھا۔ اس وقت بیگم صاحبہ نے اس کو کہلایا کہ اگرچہ مقدمہ میں آپ میرے مخالف تھے۔ لیکن میں آپ کی دیانت داری کی قدر شناس ہوں۔ آپ میری ملازمت میں آجایئے اور آپ کے بعد آپ کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک جاری رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

(بحوالہ: تذکرہ نسوان ہند از فصیح الدین بلخی، مطبوعہ 1956)

غازی پور، یوپی میں بھی زمینداری تھی امام باندی بیگم وہاں کی جائداد کی دیکھ ریکھ بھی کر رہی تھیں۔ اس کی روایت میں مولانا سید رضا اپنے کتابچہ بعنوان "مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ گلزار باغ، پٹنہ" میں رقمطراز ہیں:

"......آپ کی غازی پور میں کافی عالی شان عمارت چہل ستون کے نام سے تھی۔ جس کا صدر دروازہ اب بھی موجود ہے اور وہ پرانی تاریخ کی یاد دلاتا ہے۔ سرنگ اور پھانسی گھر جیسی نادرات ہونے کی بنا پر آج بھی یہ عمارت خلائق کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ وہاں ایک پتھر بھی نصب ہے، جس پر تحریر ہے 'یہ زمین امام باندی بیگم نے انگریز حکومت سے مقدمہ لڑ کر واپس لی۔' باغ کے تالاب کے بارے میں مشہور تھا کہ بیگم صاحبہ سرنگ کے ذریعہ تالاب تک غسل کرنے جایا کرتی تھیں۔ یہ باغ اس وقت باون (52) بیگھہ کا تھا۔ اب اس باغ میں سنٹرل گورنمنٹ نے ریل کی پٹری بچھا دی ہے اور ریاستی حکومت نے بائی پاس کے لیے کافی چوڑی سڑک بنا دی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ باغ اب اٹھائیس (28) بیگھہ میں سمٹ گیا ہے۔ اس باغ میں ایک مسجد اور کافی قدیم مقبرہ بھی ہے۔"

مختصر یہ کہ بیگم صاحبہ نے اپنی ساری جائداد جو صوبہ بہار اور شہر غازی پور، یوپی میں تھی سب کو وقف کر دیا۔ انھوں نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا اور عتبات عالیات کی زیارتوں سے مشرف ہوئیں۔ انھوں نے گلزار باغ پٹنہ میں لبِ سڑک، عالم گنج تھانہ کے مدمقابل امامیہ مسجد اور امام باڑہ کی تعمیر کرائی۔ علاوہ ازیں وقف ہاؤس کے مدمقابل اپنے اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے الگ سے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جس کی پرانی مسجد خاکسار نے بھی دیکھی تھی۔ اب یہ مسجد جدید تقاضے کے مطابق تعمیر ہو چکی ہے جس کی دیکھ ریکھ اب مقامی مسجد کمیٹی کے ارکان

کرتے ہیں۔اس مسجد میں امام باندی کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔

امام باندی بیگم اگرچہ زمیندار اور بے شمار دولت وثروت کی اکیلی مالکہ اور منتظمہ تھیں لیکن اپنی زندگی عیش وعشرت کے ساتھ گزارنے کے بجائے عوامی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی فکر کرتی تھیں۔ وہ صوبہ بہار کی ایک مشہور و معروف مخیّرہ اور باصلاحیت خاتون تھیں۔ وقف کردہ وقف اسٹیٹ کے اندر ایک خوبصورت اور شاندار امام باڑہ ہے جو دُور سے دیکھنے پر اس کے محراب وگنبد سے کربلا معلیٰ کی شبیہ معلوم ہوتا ہے۔اس امام باڑہ میں محرم کی مجالس عزا کے علاوہ سال بھر دوسری مجالس بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔اس امام باڑہ کی تعمیر امام باندی بیگم نے اپنے زمانہ میں کرائی تھی۔

امام باندی بیگم صاحبہ علم وادب کی شیدائی بھی تھیں۔ وہ نہ صرف شعروسخن سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ ادب نوازی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔انھوں نے اپنے امام باڑہ میں مرثیہ خوانی کے لیے مشہور زمانہ اور معروف رثائی شاعر مرزا دبیر کو آنے کی دعوت دی بلکہ انھیں عشرہ محرم میں مرثیہ خوانی کے لیے ہر سال پانچ ہزار اشرفی دیا کرتی تھیں۔اس رقم کے بارے میں مولانا اسد رضا نے اپنے کتابچہ بعنوان ''مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ ،گلزار باغ ،پٹنہ'' میں لکھا ہے جبکہ اس سے زیادہ کا تذکرہ محمود علی خاں صبا نے آٹھ ہزار روپیہ نذرانہ کا ذکر کیا ہے جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔ یہ سلسلہ صرف مرزا دبیر کے وقت تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے پوتے تک جاری رہا۔مرزا دبیر کا تعلق عظیم آباد سے امام باندی بیگم کی وساطت سے ہوا۔اس سلسلے میں مرزا محمد زماں آزردہ نے اپنی مذکورہ کتاب'' مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے،مطبوعہ 2005 میں لکھا ہے کہ:

''مرزا دبیر کا تعلق صوبہ بہار بالخصوص عظیم آباد سے رہا ہے۔ عظیم آباد سے وابستگی اور دلچسپی اس بات کا مظہر ہے کہ وہ جب تک حیات رہے مستقل عظیم آباد آتے رہے۔شاد عظیم آبادی، سید مسعود حسن رضوی ادیب اور سید محمود علی خاں صبا اس بات پر متفق ہیں کہ مرزا دبیر عظیم آباد پہلے پہل نواب جعفر خاں فیض کی استدعا پر تشریف لائے تھے۔''

''مرزا دبیر عظیم آباد میں'' از محمود علی خاں صبا،مطبوعہ مضمون سہ ماہی معاصر، پٹنہ 1973 میں محمود علی خاں صبا نے لکھا ہے کہ:

''مرزا دبیر عظیم آباد میں امام باندی بیگم کے ہاں دولی گھاٹ میں فرود ہوئے مگر مجلس کا انتظام نواب علی عظیم خاں کی گلزار باغ کی حویلی کے امام باڑہ میں کیا گیا۔موجودہ امام باڑہ کی تعمیر اس وقت نہیں ہوئی تھی۔ بعد کو امام باندی بیگم صاحبہ نے باہر کے رہائشی مکان جہاں نواب نورالحسن خاں اور جعفر حسن خاں رہا کرتے تھے،کو توڑ کر اسی جگہ ایک نہایت شاندار امام باڑہ زرِ کثیر خرچ کر کے تعمیر کرایا۔''

محمود علی صبا مزید لکھتے ہیں:

''مرزا دبیر جب تک زندہ رہے اس امام باڑہ میں عشرہ محرم کی مجلس پڑھی۔امام باندی بیگم صاحبہ نے بھی دل کھول کر مرزا دبیر کی عزت افزائی کی۔ آٹھ ہزار روپیہ نذرانہ کے علاوہ خلقت و زادِ راہ عنایت کرتیں۔ 19/دسمبر 1890 کو امام باندی صاحبہ نے امور خیر کے لیے اپنی کُل املاک وقف کر دی اور وقف نامہ میں مرزا دبیر کے خاندان نسلاً بعد نسلٍ عشرہ محرم کی مجلس پڑھنے کے لیے مقرر کر دیا۔''

(حوالہ: مرزا دبیر عظیم آباد میں از محمود علی خاں صبا، سہ ماہی معاصر، پٹنہ، 1973)

امام باندی بیگم صاحبہ، خود شاعرہ تھیں اور یہ مرزا دبیر کی شاگردہ تھیں۔ بہ حیثیت رثائی شاعرہ مذکورہ کتاب ''بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقا از سلطان آزاد، مطبوعہ 2020 میں نمونۂ کلام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ''مرزا دبیر اور ان کے بہاری تلامذہ'' تحقیقی مضمون مشمولہ کتاب تحقیق وتوضیح ، مطبوعہ 2022 میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ویسے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنی مذکورہ کتاب ''دبستان دبیر''، مطبوعہ 1966 میں امام باندی بیگم صاحبہ کی ادب نوازی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''عظیم آباد کی مشہور، ادب نواز اور شیدائے اہل بیت خاتون سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ، عفّت ، مرزا صاحب (مرزا دبیر) کی شاگرد اور بہار کی ایک جلیل القدر شاعرہ تھیں۔آپ ہی نے 1860 میں مرزا صاحب کو لکھنؤ سے عظیم آباد بلوایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد سے جب تک مرزا زندہ رہے ہر سال محرم میں عظیم آباد جاتے تھے۔ان کے انتقال سے مرزا اوج اور مرزا محمد طاہر رفیع اس منبر کو زینت دیتے رہے اور اب مرزا محمد طاہر کے صاحبزادے مرزا محمد صادق ہر سال اس امام باڑے کی مجالس پڑھتے ہیں۔گویا گلزار باغ پٹنہ کے اس تاریخی امام باڑہ میں مرزا صاحب کا خاندان مستقل ایک سو سال سے خواندگی کر رہا ہے اور نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی بدولت آج بھی اس خاندان کی کفالت ودستگیری کر رہی ہے۔''

مرزا دبیر کے امام باڑہ گلزار باغ میں آنے کا سال بقول فصیح الدین بلخی 1274ھ بمطابق 1853 ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے

مطابق 1860 ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ، عفت عظیم آبادی کا تذکرہ بحیثیت شاعرہ، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی کتاب ''دبستان دبیر (مطبوعہ 1966) اور بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقاء از سلطان آزاد، مطبوعہ 2020 اور مذکورہ مضمون بعنوان ''مرزا دبیر اور ان کے بہاری تلامذہ'' مشمولہ مجموعہ مضامین ''تحقیق وتوضیح'' از سلطان آزاد (مطبوعہ 2022) میں ملتا ہے۔ جبکہ تذکرہ نسوان ہند از فصیح الدین بلخی (مطبوعہ 1956) میں باب ''شہیرات'' میں ان کے ذاتی وصف کی حیثیت سے شہرت یافتہ خاتون کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

امام باندی بیگم صاحبہ عفّت ظیم آبادی کی شعروشاعری کے دوسرے اصناف کی خبر تو کہیں سے نہیں ملتی البتہ رثائی شاعری کی اطلاع ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی سے ملتی ہے وہ فرماتے ہیں:

''امام باندی بیگم صاحبہ، سلام اور نوحے وغیرہ کہتی تھیں اور عفّت تخلص فرماتی تھیں۔ ان کے چند سلام ''دفتر ماتم'' میں شائع ہوئے ہیں اور بعض سلاموں کی مرزا نے تخمیس بھی کی ہے۔ ان کے اشعار میں خلوص وتاثیر کے ساتھ ہی مضمون آفرینی کی سعی بھی پائی جاتی ہے۔ اور جو کچھ کہتی تھیں دل کی گہرائی سے کہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اچھے اچھے شعر نکال لیتی تھیں۔ ان کی زبان بڑی پاکیزہ اور ستھری ہے۔''

بلاشبہ ان کے اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر بلند پایہ کا شعر کہتی تھیں۔ ان کے ایسے کلام میں عقیدت بھی ہے اور بھرپور ادبیت بھی۔ نمونۂ کلام اس طرح ہے ملاحظہ ہوں:

پایا یہ اوج مدح درِ بو تراب سے
مطلع سلام کا ہے بلند آفتاب سے
روشن ہے دین سبط رسالت مآب سے
جس طرح رات چاند سے دن آفتاب سے
زانوے شمر و سینۂ بے کینۂ حسین
اپنا تو دم اُلٹتا ہے اس انقلاب سے
لیتا ہے حسن روئے مبارک خراج میں
بو گل سے، رنگ لالہ سے، نور آفتاب سے
سر پردہ چار گیسوئے مشکیں ہیں اشکار
جن سے دو چار ہووئے نہ سنبل حجاب سے
غنچہ سکوت میں لب جاں بخش کے حضور
شبنم عرق عرق درِ دنداں کی تاب سے
پر حیف خطِ عارض تاباں میں ہے رقم
اس نوجواں کا سِن نہ بڑھے گا شباب سے

---

مجرئ خاتون محشر پر ہے محشر ان دنوں
شاہ دیں بے گور ہیں زینب ہیں بے گھر ان دنوں
شام ہوتی ہے کہیں اور صبح ہوتی ہے کہیں
روز و شب گردش میں ہیں زہرا کے اختر ان دنوں
تپ کی شدت، باپ کا ماتم اور ایذائے سفر
ہو گئے ہیں اور بھی سجاد لاغر ان دنوں
کربلا کہتی تھی زینب سے یہ کیا ہے ماجرا
دیکھ کر منہ میرا رو دیتے ہیں سرور اِن دنوں

مختصر یہ کہ امام باندی بیگم عفّت عظیم آبادی اپنے وقت کی مشہور خاتون، مخیّرہ، سماجی وفلاحی خدمت گزار، رعایا پرور، شاعرہ، ادب نواز اور مہمان نواز تھیں۔ اکثر علماء بھی ان کے مکان میں مہمان ہوا کرتے تھے۔ ان میں مفتی میر عباس صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایسی مشہور شہرت یافتہ علم پرور اور ادب نواز خاتون کو اپنے وقت کی برگزیدہ شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ اس برگزیدہ شخصیت کا انتقال 28 رصفر مطابق ۱۴ راگست 1894 کو ہوا۔ ان کا مقبرہ ان کے وقف ہاؤس کے پچھّم جانب نجی قبرستان میں ہے جہاں ان کے فرزند اور ان کے شوہر کا فرضی مقبرہ بھی اُسی چہار دیواری میں ہے۔ ان کی یاد میں برائے ایصال ثواب ہر سال سہ روزہ دیسہ کی مجالس امام باندی بیگم وقف اسٹیٹ کے امام باڑہ میں منعقد ہوتی ہیں۔

حوالے:


1 مختصر تاریخ وقف اسٹیٹ گلزار باغ۔ از مولانا سید اسد رضا
2 تذکرہ نسوان ہند۔ از فصیح الدین بلخی
3 دبستان دبیر۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
4 بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقاء۔ از سلطان آزاد
5 مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے۔ از مرزا محمد آزردہ
6 تحقیق وتوضیح۔ از سلطان آزاد
7 سہ ماہی رسالہ معاصر، پٹنہ (1973)



**Sultan Azad**

Ashaiana-e-Sultan, Pannu Lane

Gulzarbagh, Patna-800007 (Bihar)

Mob: 8789934730

# شاعرات کے منتخب اشعار

ذہن و دل کے فاصلے تھے ہم جنھیں سہتے رہے
ایک ہی گھر میں بہت سے اجنبی رہتے رہے

دور تک ساحل پہ دل کے آبلوں کا عکس تھا
کشتیاں شعلوں کی دریا موم کے بہتے رہے

عفت زریں

جو ہم سے زندگی ہر دم خفا معلوم ہوتی ہے
ہمیں تو صاف اپنی ہی خطا معلوم ہوتی ہے

سنور جاتا ہے اس سے بات کر کے یوں مرا لہجہ
مجھے خود دل نشیں اپنی صدا معلوم ہوتی ہے

نسیم سید

ہماری ذات میں بارود کس نفی کا ہے
کہ ٹوٹ ٹوٹ کے سارے پہاڑ گرتے ہیں

مرے سورج کو دے کوئی صدا کہ
میں بھیگے پر سکھانا چاہتی ہوں

عذرا پروین

موسم خوشبو رنگ دھنک کے منظر سارے اس کے تھے
رات کی کالی چھایا میری چاند ستارے اس کے تھے

کتنی عجب تقسیم تبسم کرتی ہے یہ دنیا بھی
میرا حصہ زہر ہلاہل امرت دھارے اس کے تھے

کہکشاں تبسم

آج تک حالات چہرے کے نہیں بدلے مرے
آئینہ گھر کا بدل دینے سے کیا ہو جائے گا

تیری یادوں کے سہارے سے سنور جاؤں گی
ساری دنیا کی نگاہوں میں اتر جاؤں گی

کرشنا شرما دامنی

ہم وفاؤں پہ مٹ تو جائیں گے
بے وفاؤں سے پیار کون کرے

اس کی رحمت پہ تو بھروسہ ہے
آپ کا اعتبار کون کرے

نعیمہ جعفری پاشا

ہجر جب طے ہے تو بے کار نہ حجت کرنا
جانے والے کو بہت پیار سے رخصت کرنا

ہم کو آداب محبت نہیں آتے سیما
ہم کو بس ٹوٹ کے آتا ہے محبت کرنا

سیما نقوی

صحرا سے تشنگی کا سبب پوچھتے ہو کیا
دریا بھی ہم نے دیکھے ہیں پیاسے کبھی کبھی

ہر دل کو آپ آئینہ خانہ نہ جانیے
پتھر سے سخت ہوتے ہیں شیشے کبھی کبھی

صبیحہ سنبل

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا

# غضنفر کے ناولوں میں احتجاجی رجحانات

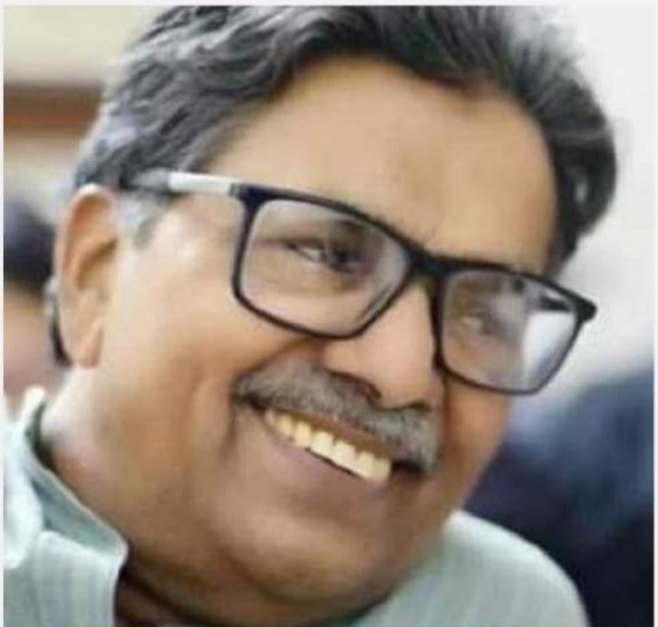

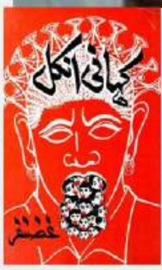

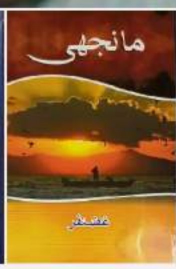

معاصر اردو فکشن میں غضنفر اپنے تجربات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں ہیئت، مواد، موضوع، اسلوب، زبان، بیان ہر سطح پر تجربہ کیا ہے لیکن ان تجربوں کے ساتھ ساتھ قدر مشترک کی حیثیت سے احتجاجی رویہ بھی ان کے تقریباً تمام ہی ناولوں میں نمایاں ہے۔

اب ان کے پہلے ناول ''پانی'' کو ہی لے لیں۔ اول سے آخر تک بے نظیر دشت و بیاباں میں پانی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے پانی نظر بھی آتا ہے تو اس پر مگر مچھ اپنی سرخ آلود زبانوں کے ساتھ قابض رہتے ہیں مگر وہ ہار نہیں مانتا وہ پیاس سے تڑپتے ہوئے بنیادی وسائل سے محروم لوگوں کو ہمت دلا کر آگے بڑھنے اور مگر مچھ کی اجارہ داری کے خلاف احتجاج کرنے کو کہتا ہے۔ انھیں مار بھگا کر پانی کی دستیابی کی شکل میں اپنے حقوق کی حفاظت کی ترغیب دیتا ہے۔ ناول کے کچھ کلیدی جملے دیکھیں اور اندازہ کریں کہ غضنفر کے یہاں احتجاج کا یہ رنگ کتنا گہرا ہے۔

''اس نے پتھر والا ہاتھ کمان کی طرح تان لیا''

''نہیں میں اسے مارے اور اپنی پیاس بجھائے بنا ادھر نہیں آ سکتا''

''بے نظیر نے پوری طاقت سے اپنے ہاتھ کا پتھر ان کی طرف اچھال دیا (ص38)

''ٹھیک ہے وہ اپنی جگہ پر تاجدار سہی لیکن آخر ہم بھی تو کچھ ہیں۔ تالاب پر نہ سہی پانی پر ہمارا ابھی تو کچھ حق ہے اور ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق ملے۔۔ یوں نہ سہی تو یوں سہی'' (ص38)

''پھر دامن تار تار سے زخموں کو صاف کیا۔ پیروں اور تلووں سے کانٹوں کو نکالا۔ جانوروں کی طرح رینگ کر خندق سے باہر نکلا۔۔۔ اور کراہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔'' (ص89)

درج بالا جملوں کی قرآت سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غضنفر کے احتجاج میں کتنی شدت ہے وہ کس طرح اس مختصر سے ناول کو زماں و مکاں کی قید سے آزاد کر کے اسے ساری دنیا کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے خلاف احتجاج کی علامت بنا دیتے ہیں۔ وہ کمزور و نحیف شخص کے اندر بھی ہمت لگن اور جوش کے ساتھ احتجاج کی وہ شدت پیدا کر دیتے ہیں جس سے وسائل پر قابض مگر مچھ نما سرمایہ داریوں کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

آخر کار ناول ''پانی'' میں پانی کی حصولیابی کی تگ و دو اور وسائل حیات پر کیے گئے قبضہ کے خلاف زبردست احتجاج کا سلسلہ دراز ہو کر ناول ''مم'' تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ سلسلہ کچھ اس طرح کامیابی کی حصولیابی کے ساتھ تھمتا ہے کہ سرمایہ داروں کی چولیں ہل جاتی ہے ہیں اور ان کی کربناک چیخ بلند ہو کر اس بات کا اشاریہ بن جاتی ہے کہ ان کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

اگرتم نے نہیں جانا/ تو یہ جان لو/کہ یہ چیخ سب کچھ چھن جانے کی چیخ ہے/ یہ چیخ بے بس ولاچار ہوجانے کی چیخ ہے/ یہ چیخ وہاں سے نکلی ہے/ جہاں ہمارا پانی تھا/ ہے اور یہ چیخ ان کی چیخ ہے/ جن کے پیروں سے پانی کھسک چکا ہے/جن کے پاؤں زمین پر آگئے ہیں/ہاں یہ چیخ انھیں کی ہے/ جوآبِ حیات تو پی چکے ہیں/مگراب/ جونہ مرسکتے ہیں/ اور نہ جی سکتے ہیں۔

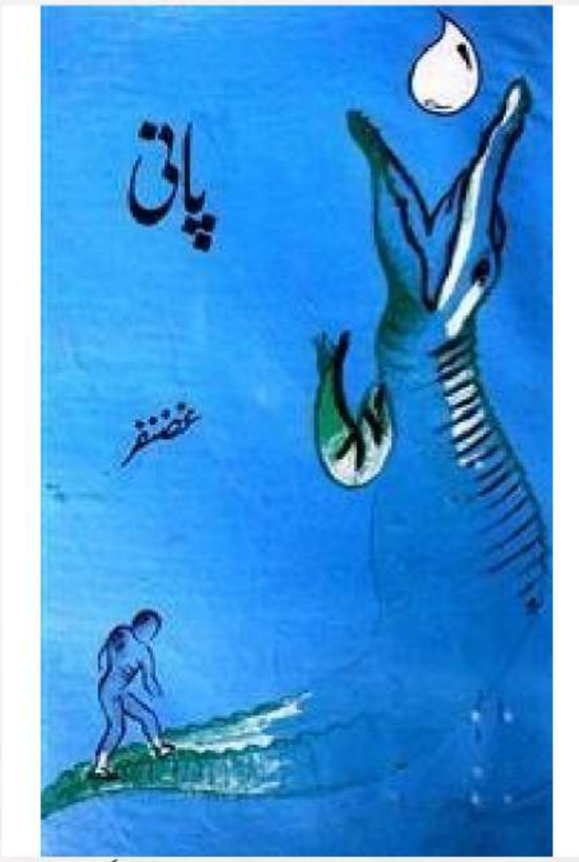


دراصل غضنفراس بات سے واقف ہیں کہ احتجاج زندگی کی علامت ہے اور خاموشی موت کی، احتجاج کے بغیر زندگی روح سے خالی جسم کی مانند ہے۔ ناول بھی تو زندگی کی کہانی ہے لہذا تضادات زندگی کے خلاف احتجاج جس طرح کامیاب زندگی کے لیے ناگزیر ہے اسی طرح ناول کے لیے بھی یہ ایک اہم جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی اور مم کے ساتھ ہی ان کے دوسرے ناولوں میں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے۔

''کینچلی'' حالانکہ شادی کے فوراًبعد فالج زدہ ہوئے شوہر دانش اور اس کی خوبصورت اور ذمہ دار بیوی مینا کی کہانی ہے مگر یہ سماج ،فلسفہ اور قانون کے مروجہ اصولوں کے خلاف اٹھنے والی ایک توانا آواز بھی ہے اور ایک جرأت مندانہ قدم بھی۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کبھی کسی زاویے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ غضنفر نے اس اچھوتے موضوع کو بھی بڑی ہی کامیابی سے اس ناول میں برتا ہے۔ روٹی کپڑا اور جنسی رشتہ سے الگ ایک ایسا رشتہ بھی ہوتا ہے جس میں درد مشترک ہوتا ہے جس کے تحت جنسی تقاضے کی تکمیل نہ ہونے کے باوجود مینا اسے بے حد چاہتی ہے اس کا خیال رکھتی ہے اور اسے چھوڑ کر نہیں جاتی اور دانش بھی اس کے فطری تقاضوں کی تکمیل پر اسے نہیں ٹوکتا اور وہ دونوں رسم ورواج اور فلسفہ کی اس کینچلی کو اپنے ذہن ودل سے اتار پھینکتے ہیں اور یوں ایک بڑے بوجھ سے چھٹکارا پاکر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزارنے لگتے ہیں اس ناول میں غضنفر کے احتجاج کی نوعیت جداگانہ ہے جس کی وجہ سے دل ودماغ میں انقلابی تبدیلی آتی ہے اور پھر زندگی کی گاڑی ایک خاص نہج پر چلنے لگتی ہے

اسی طرح کے ایک ذہنی انقلاب کا تجربہ غضنفر نے ''کہانی انکل'' میں بھی کیا ہے یہ اردو ادب میں غالباً اپنی نوعیت کا پہلا ناول ہے جس میں مروجہ نظام ظلم وجبر کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے بچوں کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح کی جاتی ہے انھیں کوا اور کلہاڑا، سپیرا سانپ، گدھوں کے سینگ، پھولی ہوئی لومڑی، گائے اور راکشس اور ٹھپے والا سانڈ وغیرہ جیسے مختلف عنوانات کے تحت کہانیاں سنائی جاتی ہیں یہ کہانیاں دراصل علامتی ہیں اور بچوں کی ذہنی سطح اور ان کی دلچسپیوں کا خیال رکھتے ہوئے کہانی انکل نامی کردار کے ذریعے اس ناول میں پیش کی گئی ہیں یہ کہانی انکل دراصل ایک تخلیقی مفکر ہے جو بچوں کے شعور کو بالیدہ کر کے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ حق وباطل، اصل ونقل کے درمیان تمیز کر سکیں اور اپنے اندر اتنی ہمت بھی مجتمع کر سکیں کہ وہ نظام ظلم وجبر کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کر سکیں۔ اس کی یہ کوشش اس وقت کامیاب ہوتی نظر آتی ہے جب کہانی کمیشن کی بیٹھک میں اپنی کہانیوں کے ذریعہ بچوں کے مستقبل تاریک کرنے کے الزامات اس پر عائد ہوتے ہیں، اس پر پابندی لگائی جاتی ہے اور نہ ماننے کی صورت میں اس کی زبان تک کاٹ لی جاتی ہے تب بچوں کا ایک جم غفیر کچھ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ:

ان کے دیدوں میں انگارے بھر گئے/ نگاہیں شرربار ہوگئیں/ تیوریاں چڑھ گئیں/ بھنویں تن گئیں/مٹھیاں بھنچ گئیں/خون کھول اٹھا/ رگیں پھولنے لگیں/مشتعل مجمعے سے زخمی شیر کی دہاڑ کی طرح چیخ ابھری:

کہانی انکل کی زبان کاٹنے والے

کان کھول کر سن لیں/ اور اگر آنکھیں ہیں تو دیکھ لیں/ کہانی انکل کی زبان کٹی نہیں بلکہ ہمارے منہ میں آگئی ہے''(ص267)

اس منظر کو دیکھ کر درد سے کراہتے ہوئے کہانی انکل میں گویا جان دوڑ گئی اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ظلم وبربریت اور ناانصافیوں کے

خلاف احتجاج عروج پر تھا جس کی گڑگڑاہٹ نے ایوانوں میں بھی شگاف ڈال دیا تھا۔اور پھر

کہانی انکل کی آنکھیں/ یکا یک روشن ہوگئیں/ جیسے بجھا ہوا الاؤ / پھر سے جل اٹھا ہو(ص 268)

آنکھوں کا روشن ہو جانا اور بجھے ہوئے الاؤ کا پھر سے جل اٹھنا امید کی علامت اور جائیت کا اشاریہ ہے زبان کی قربانی کے باوجود کہانی انکل نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی اس کی ایک زبان کے بدلے سینکڑوں منھ میں زبانوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے جس سے تاریکیاں لرزہ براندام ہوگئی تھیں۔غضنفر صاحب نے اپنے اس ناول کے ذریعہ بھی جبر کو زیر کرنے کی جو شعوری کوشش کی ہے وہ قابل تعریف ہے ان کے احتجاجی رنگ کا جادو یہاں سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ناول ''فسوں'' میں بھی غضنفر نے احتجاج کے کئی الاؤ سلگا دیئے ہیں انھوں نے اس ناول کی شکل میں کیمپس ناول اردو ادب کو دیا ہے جس میں کیمپس کے اندر ہونے والی سیاست کے ساتھ ہی ریاستی اور قومی سطح پر ہونے والی سیاست پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے مسائل کا احاطہ کر کے ان کے تدارک کی کوششیں کی ہیں اور صدائے احتجاج بلند کرنے کے ساتھ ہی ان کے حل کی جانب بھی پیش قدمی کی ہے یونیورسٹی کیمپس میں طلبہ کی ایک جماعت ناقص تعلیمی نظام، مادہ پرستی، خودغرضی، حق تلفی اور استحصال جیسی برائیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لائٹ'' نامی اخبار نکال کر ان کوتاہیوں کی نشاندہی کرتی ہے تاکہ ان کا ازالہ کیا جا سکے اور پہلے ہی شمارے میں تعلیم کا الٹا سفر''راج نیتی کیا'' اور مذہب کی پگڈنڈیاں'' وغیرہ نامی مضامین سے تہلکہ مچا دیتی ہے۔چند ایک اقتباسات دیکھیں:

''راج کے مراکز پر غور کریں تو وہ چڑیا خانہ نظر آئیں گے
جہاں طرح طرح کی کھال میں بھانت بھانت کے جانور
جمع ہوگئے ہیں جن کی زبانیں بھوک سے بے چین ہو کر
ہونٹوں پر پھر رہی ہیں اور دانت کسی کی بوٹیاں نوچنے کے
لیے بے تاب ہیں"۔

(بحوالہ ناول،فسوں،مشمولہ آبیاژہ،ص 427)

''اگر مداریوں کا منہ نہیں سیا گیا، جانوروں کے دانت توڑے
نہیں گئے، کوؤں کی چونچ بند نہیں کی گئی تو راج کا حال کیا ہو
جائے گا،اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں:(ایضاً)

''لائٹ'' کا دوسرا شمارہ تو مزید ہنگامہ خیز ت تھا ناول کے باب ''سنک'' کا یہ طویل اقتباس دیکھیں:

''لائٹ کا دوسرا شمارہ زلزلہ ثابت ہوا تھا/ یونیورسٹی انتظامیہ طلبہ عوام سب کو کھلبلی مچ گئی تھی/ لائٹ کی گرمی نے بدعنوانیوں کے پہاڑ کو پگھلا دیا تھا/ دبی ہوئی سچائیاں آتش فشاں کی طرح پھٹ کر کے باہر آ گئی تھیں/غیر ممالک سے اڑا کر لائی گئی تحقیقی ڈگریاں/ چربائی عمل سے چرائی گئی کتابیں /تعلیمی معاملوں میں استعمال کی گئی سازشیں/ امتحانی چال بازیاں / انتظامی سیاہ کاریاں / طلباء پر ڈھائی گئی ستم ظریفیاں/ بے زبانوں کی حق تلفیاں/گھناؤنی ضمیر فروشیاں/ بوڑھے شوہر کے چنگل میں پھنسی کم عمر بیویوں کی المناکیاں/ سلیکشن کمیٹیوں میں اپنائے گئے تجارتی طریقے/ سیاست کے ہتھکنڈے / اختیارات کے نقشے / اخلاقیات کے ڈھکوسلے/ سارے کے سارے لاوے کی طرح باہر آ گئے تھے/ نتیجے میں ایک طرف چہرے سیاہ پڑ گئے تھے/ اور اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی ہونے لگی تھیں/تو دوسری طرف خاموشیاں چونک پڑی تھیں/ بیداریاں انگڑائی لینے لگی تھیں/ لائٹ جگہ جگہ زیر بحث تھا۔''(ص 435)

آخر جو ہونا تھا وہ ہوا اس تہلکہ خیزی کے بعد انتظامیہ نے لائٹ، پر پابندی لگا دی تو جیالوں نے''بوم کلب'' نامی تنظیم کی بنیاد ڈال دی لیکن اس تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرتے یہ جیالے آخر کار خود ہی حالات سے جوجھتے ہوئے مختلف اطراف میں نکل پڑے، زندگی کی جنگ میں کچھ کامیاب تو کچھ ناکام ہوئے ایک طالب علم حادثہ کا شکار ہو کر گندی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا۔کیمپس کی اس سیاست کے ڈانڈے ریاستی اور ملکی سیاست سے بھی جڑے بھانت بھانت کے لوگوں کے چہروں سے نقاب اتار کر غضنفر نے تعلیمی ،سیاسی وسماجی سسٹم کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے اور یہ ناول''فسوں'' بھی کیمپس ناول کی شکل میں احتجاج کا بلیغ اشاریہ ہے۔

ناول ''شوراب'' میں بھی موضوع بحث نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہے جو ہر طرح سے مسائل میں گھرا ہوا ہے اور کسب معاش کی خاطر دیار غیر تک کا سفر طے کرتا ہے لیکن پھر بھی پریشانیاں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں، ہجرتیں اس کا مقدر نہیں بدلتیں۔غضنفر کی نگاہ دوربیں اپنی زمین پر ٹھوکریں کھانے اور اپنی زمین سے اکھڑ جانے والے دونوں ہی قسم کے نوجوانوں کے درد کو سمجھتی ہے۔اس ناول میں بھی غضنفر نے سماجی ناہمواریوں، بے جوڑ شادیوں، بیٹی کو بوجھ سمجھ کر جلد اتار پھینکنے والوں، پردیس میں رہ رہے

نوجوانوں اور دوسری طرف ان کی بیویوں کو تل تل مارتے ہوئے مسائل کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ ان کی بنیادی اور فطری ضرورتوں کی تکمیل نہ ہونے پر ان کا درد بھی سانجھا کیا ہے۔ اعلی تعلیم یافتہ شہری لڑکی کی دیہاتی سسرالی زبان سے پیدا شدہ گھریلو مسائل پر بھی ہمدردانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے مگر پورے ناول میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے غم و غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کرداروں کی زبانی احتجاج کیا ہے، سوال کھڑے کیے ہیں اور سماج کو ان سوالوں کے گھیرے میں کھڑا کر کے اپنا احتجاج درج کرایا ہے۔

غضنفر کا ناول ''دویہ بانی'' شدید احتجاج کی ہی علامت ہے دویہ بانی جو عرفان ذات اور شعور و آگہی کا استعارہ ہے اس سے کمزور اور نچلے طبقے کو جان بوجھ کر محروم رکھا جاتا ہے کہ کہیں ان کے اندر بھی علم و آگہی کے سوتے نہ پھوٹ جائیں اور وہ اپنی حالت سے باخبر نہ ہو جائیں۔ ویدک دور سے دور حاضر تک یہ سلسلہ دراز ہے آج اس ٹیکنالوجی کے عہد میں بھی اس طبقاتی نظام کی بیخ کنی نہیں کی جا سکی ہے اور آج بھی اونچ نیچ کا بھید بھاؤ ذہنوں میں موجود ہے۔ غضنفر کے اس ناول میں صدیوں سے جاری اس تفریق و امتیاز پر سوال کھڑا کیا گیا ہے اور احتجاج کے شعلے مظلوم کے بجائے ظالم طبقے کے ایک فرد کی جانب سے بھڑکائے گئے ہیں۔

بالیشور گاؤں کے پجاری ''بابا'' کا اکلوتا پوتا ہے جو اس ناول میں احتجاج کی توانا آواز بن کر پورے منظر نامہ پر چھا جاتا ہے۔ وہ اپنے دادا کے برخلاف طبقاتی نظام کے یکسر خلاف ہے اور یہ سوچتا ہے کہ دویہ بانی پر بلا کسی تفریق کے سب کا حق ہونا چاہیے ہر کوئی اسے سن کر روحانی طمانیت سے ہمکنار ہو سکتا ہے اس سے شعور کی آنکھیں کھلتی ہیں ذہنوں میں پڑے ہوئے جالے صاف ہوتے ہیں اگر یہ دویہ بانی چمٹولی کے لوگوں کو سنا دیا جائے تو وہ بھی اپنی حالت میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ''نالا'' کی جگہ ''ندی'' میں نہا سکتے ہیں یعنی ان کے اندر بھی صفائی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے، وہ خود کو بدلنے کی تدبیریں کر سکتے ہیں یہی سب سوچ کر یہ جانتے ہوئے بھی کہ بالو کے باپ جھگڑو کو دویہ بانی سننے کے ہی پاداش میں سب کے سامنے سیسہ پگھلا کر کان میں ڈال دیا گیا تھا بالیشور کسی بھی طرح سے خود کو روک نہیں پاتا اور پورے سسٹم کے خلاف کچھ اس طرح سے احتجاج کرتا ہے کہ بالو کو دویہ بانی سننے پر مجبور کرتا ہے کیوں کہ وہ شخصیت اور معیار کے تضاد کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس طبقے کے لوگوں میں بھی اپنے حالات کے تئیں بے حسی کو ختم کر کے انھیں بھی کچھ ہونے کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بندیا، ایک اچھوت کنیا ہے اور بابا کے ہوس کی شکار ہو چکی ہے وہ بندیا سے محبت کرتا ہے اس کے اندر خوبصورتی کے احساس کو بیدار کرتا ہے۔ بالیشور کے دادا یعنی پجاری بابا پر یہ دونوں خبریں بجلی کی طرح گرتی ہیں وہ کچھ سوچتا ہے اور ڈنڈ کے طور پر بالو کے ساتھ بھی جھگڑو والا رویہ اختیار کرتا ہے اور بندیا کی تو سانپ کاٹنے سے موت ہی واقع ہو جاتی ہے۔ اس میں سانپ بھی ایک ایسے موذی سسٹم کی شکل میں سامنے آتا ہے جو شروع سے آخر تک بابا یا اونچی برادری کی مرضی کے مطابق پورے نظام پر اپنا پھن پھیلائے موجود رہتا ہے جو آخر میں بالیشور کے ہاتھوں ہی موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور یوں احتجاج کچھ اپنوں کی آہوتی دینے کے باوجود آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناول کے ذریعہ غضنفر نے نچلے طبقے کی جان کے ساتھ ہی ان کے مال اور فصلوں کو بھی اگنی دیوتا کی نذر کرنے پر احتجاج کیا ہے اور برہمنوں کی اس چال کا پردہ فاش کیا ہے جس کے تحت وہ انھیں معاشی طور پر کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ ناول نگار نے اس سسٹم کے خلاف بھی احتجاج کیا ہے جو تعلیم حاصل کرنے کا حق صرف اونچی برادری والوں کو دیتا ہے غرض یہ ناول اول تا آخر اونچی ذات کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف زبردست احتجاج کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

''وش منتھن'' ایک ایسا ناول ہے جس میں غضنفر نے دور حاضر کے اہم مسائل کو چھیڑا ہے اس میں بھی کمزور اور طاقتور کے مابین ذہنی اور نظریاتی تصادم کو ایسے ڈرامے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اسٹیج پر تو دکھایا ہی جاتا ہے مگر اصل زندگی میں بھی ایک ایسا ہی ڈرامہ چل رہا ہوتا ہے جس میں کمزور طبقہ کے لوگ اکثریتی اور مضبوط طبقہ کے ظلم کا شکار ہوتے ہوئے بھی مصلحتاً خاموش رہتے ہیں اس ناول میں بٹوا احتجاج کی علامت بن کر سامنے آتا ہے اور ''باہری'' کہنے پر جس طرح دینو کو تھپڑ مارتا ہے یہ اس کے احتجاج کا آغاز ہوتا ہے، جس کا باپ دیش کی سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے اپنا ایک پاؤں کھو بیٹھتا ہے جس کے سینے پر کئی کئی میڈل سجے ہوتے ہیں وہ یہاں کا نہ ہو کر باہری کیسے ہو گیا جس کی کئی پشتیں یہاں کی مٹی میں دفن ہیں جن کی پیشانی یہاں کی خاک کو اپنے ماتھے پر سجاتی ہیں وہ باہری کیسے ہو گئے یہ لفظ ''باہری'' ایک گالی ہی تو ہے غضنفر نے صرف یہی نہیں اس طرح کے کئی حساس موضوعات کو اس ناول میں پیش کیا ہے اور ان سب کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کرداروں کے اقوال و افعال کے ذریعے اپنا احتجاج درج کیا ہے ایک اقتباس دیکھیں اور ناول نگار کے احتجاج کی تہہ تک پہنچیں:

> ''یہ ہم پر الزام لگاتے ہیں کہ ہم یہاں والوں کی طرح نہیں رہتے پتہ نہیں یہ بات کن بنیادوں پر کہی جاتی ہے کیا ہمارا گھر ان کی طرح نہیں ہے؟ کیا ہمارے کپڑے ان سے مختلف ہیں؟ کیا ہمارے اناج ان سے جدا ہیں؟ کیا ہمارے پانی کا رنگ ان سے الگ ہے؟ کیا ہم کسی اور سورج سے گرمی حاصل کرتے ہیں؟ کیا ہم کسی اور ہوا میں سانس لیتے ہیں؟ کیا ہم اپنے چولہوں میں کوئی اور آگ جلاتے ہیں؟ کیا ہم کسی اور ڈھنگ سے ہنستے ہیں؟ کیا ہمارے رونے کا طریقہ ان جیسا نہیں؟''

''مانجھی'' بھی غضنفر کا ایک اہم ناول ہے انہوں نے اپنے ہر ناول کی طرح اس میں بھی تجربات کیے ہیں اور جو کہانیاں دریا میں مانجھی و یاس اور وی این رائے کے ذریعہ سنائی جاتی ہیں ان کے ذریعے بھی مختلف طرح کے تضادات کو دکھانے کی سعی کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور پے در پے سنائی جانے والی کہانیوں میں ماضی کے کچھ ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جن کے خلاف احتجاج کے طور پر غضنفر کا قلم شعلے برسانے لگتا ہے ان میں کبھی وی این رائے تو کبھی مانجھی کے ذریعہ دور حاضر کے ایسے حالات و واقعات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جس کے خلاف غضنفر سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ وہ کسی بھی طرح کے اشتہار میں لڑکیوں کے جسم کا سمبل لگا کر اس پروڈکٹ کا مارکیٹ ویلو بڑھانے پر بھی اعتراض کرتے ہیں کیوں لڑکی ہی کیوں لڑکا کیوں نہیں؟ اگر لڑکی ہے تو اس کا جسم کیوں استعمال کیا جاتا ہے دماغ کیوں نہیں؟ وہ کہتے ہیں:

> ''تو کیا عورت صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنے تشکیلی دور میں ہے؟ کیا آگے بھی اسی روپ میں رہے گی؟ یا اس میں کوئی تبدیلی بھی آئے گی''؟

(بحوالہ مانجھی ص839 مشمولہ آبیاژہ)

غضنفر محض ایک ناول نگار نہیں بلکہ ایک ایسے مفکر بھی ہیں جو زندگی میں ہونے والے تغیرات پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوئے اس کے مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں وہ تضادات زندگی کو اپنے مخصوص اسٹائل میں پیش بھی کرتے ہیں، ان تضادات کے خلاف مجسم احتجاج بھی بنتے ہیں اور اپنے کرداروں، مکالموں اور نقطۂ نظر کے ذریعے اس احتجاج کو عمومی احتجاج کی شکل میں بھی ڈال دیتے ہیں وہ صرف ناول نگار ہی نہیں فسوں گر بھی ہیں، ان کا ناول اپنے قاری کے ذہن میں کچھ ایسی سحر انگیز کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش بھی نہیں کرتا اور خود کو اس دائرے میں محفوظ سمجھتا ہے ان کی نگاہ عوام الناس کی آنکھوں میں نور بن کر پھیل جاتی ہے اور اس روشنی میں اچھے برے، سچ جھوٹ کا فرق اور واضح ہو جاتا ہے وہ خود بھی احتجاج کرتے ہیں اور دوسرے اذہان تک بھی اس احتجاج کی شدت کو پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو اور مزید توانا ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے اور خوبصورت سماج کی تشکیل و تعمیر اور اس کی حفاظت میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ غضنفر کے ناول میں ان کا احتجاجی رویہ دلوں کو پر جوش کرنے کے ساتھ حوصلہ بھی فراہم کرتا ہے کیوں کہ صبر، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ کیا جانے والا احتجاج ہی کامیاب ہوتا ہے غضنفر کے ناولوں کا احتجاجی رجحان بھی زندگی کی مثبت قدروں کے تحفظ اور منفی قدروں کے خلاف بغاوت کا اشارہ ہے۔ ☐☐☐

Dr. (Mrs.) Sabera Khatoon Hina
Assistant Prof.
T.D.B College
Raniganj
Dist. Paschim Bardwan-713347 (W.B)

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

# پکچر گیلری کا مشاہدہ و مطالعہ

قرۃ العین حیدر اردو کی معروف فکشن نگار ہیں ان کے ناول اور افسانے اردو کے افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ غیر افسانوی ادب میں بھی ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ رپورتاژ میں ستمبر کا چاند' کوہ دماوند' گل گشت' خضر سوچتا ہے اور جہانِ دیگر' خطوط کا مجموعہ ''قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام'' اور خاکوں کا مجموعہ ''پکچر گیلری'' اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل پکچر گیلری میں افسانہ پر ایک مضمون ہے، ایک رپورتاژ ''دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں'' اور 6 خاکے نما مضامین ہیں۔ جن میں سید سجاد حیدر یلدرم، داستان طراز (ردولوی محمد علی) مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی، پکچر گیلری کی ایک تصویر (شاہد احمد دہلوی) کچھ عزیز احمد کے بارے میں چاند نگر کا جوگی (ابن انشاء) خاکے شامل ہیں۔

سید سجاد حیدر یلدرم جو کہ قرۃ العین حیدر کے والد ہیں۔ ان کا خاکہ قرۃ العین حیدر نے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے خاندانی پس منظر کے بیان سے قرۃ العین حیدر کی تاریخ و تہذیب سے دلچسپی عیاں ہوتی ہے۔ ان کی سیرت، شرافت نفس، ذہانت، انکساری، دوست نوازی، روشن خیالی کو مختلف واقعات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

ان کے ادبی سفر کے بیان میں ان کے ادبی محرکات، ترکی زبان سے لگاؤ، ترکی ادب کے فن پاروں کے اردو تراجم وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

یلدرم اردو میں رومانیت کے دور کے نمائندہ قلم کار ہیں۔ ان کی رومانیت خالص مغربی (اور ترکی) رومانیت تھی ان کی تحریریں ادب لطیف کا گراں قدر حصہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ماننا ہے کہ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کے خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ شخصیت سازی میں یہ عوامل نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ سید سجاد حیدر یلدرم ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نانی سیدہ ام مریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ انھیں اخلاقی تعلیم گھر سے ملی۔ یلدرم کی انسانیت نوازی ''احترام آدمیت'' کے حوالے سے مصنفہ لکھتی ہیں:

''یلدرم کے باپ جن کے رعب و دبدبہ سے پورا بنارس تھر تھر کانپتا تھا۔ اپنے بچوں کے لیے ان کے رفیق تھے اور فلاسفر بھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کو سب سے پہلا سبق یہ پڑھایا کہ

دوسروں کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ یلدرم اور ان کے تینوں بھائیوں کی زندگیاں اس نصیحت کی کامل تفسیر رہیں۔'' (پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:5)

قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ سید سجاد حیدر یلدرم میں ''انا'' بالکل نہیں تھی اور وہ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ ''بحیثیت آرٹسٹ ان میں انا کے فقدان نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ ترکی زبان سے انھیں ذہنی لگاؤ تھا۔ برطانوی قونصل خانے میں ترکی زبان کے ترجمان کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ترکی زبان وادب سے ان کی واقفیت بڑھتی چلی گئی۔ 1902 میں احمد حکمت کے ناول ''ثالث بالخیر'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

قرۃ العین حیدر نے اس خاکے میں اس وقت کے یورپی اور ہندوستانی ادبی منظر نامے پر گفتگو کی ہے جب یلدرم نے لکھنا شروع کیا تھا۔ یلدرم کی وسیع النظری، آزادیِ نسواں کی حمایت اور روشن خیالی کے متعلق لکھتی ہیں کہ ان کے ڈراموں میں خواتین کرداروں سے ان کی فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یلدرم ان کرداروں کو گھر کی چار دیواری کی گھٹن بھری زندگی سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ ترکی ڈراموں کے تراجم اور خصوصاً ان خواتین کرداروں زہرا، حمرا، قمرا، وغیرہ کے ذریعے انھوں نے اردو پڑھنے والوں کو نئی عورت سے روشناس کرایا۔ یہ ان کی آئیڈیل لڑکیاں ہیں جو زندگی کے مختلف مراحل میں پیش پیش اپنے وجود کو منواتی نظر آتی ہیں۔

عینی آپا کا کہنا ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کی روشن خیالی کے سبب ان کے خاندان کی متعدد لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ان کے سپورٹ سے ہی ان کی اہلیہ زہرا بیگم نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کھادی کی قومی تحریک کے زمانے میں خواتین کے محاذ پر جدوجہد آزادی میں حصہ لیا اور لکھنؤ میں کرامت حسین گرلز ہائی اسکول لکھنؤ اور مسلم گرلز کالج علی گڑھ کے قیام وترقی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرتی رہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کی شادی نذر زہراء بیگم سے ہوئی۔ ان کی پھوپھی والدہ افضل علی نے ایک معاشرتی ناول ''گودڑ کا لال'' لکھا تھا جو اردو ناول کے ارتقاء کے باب میں خواتین کے اولین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

آخر میں مصنفہ نے یلدرم کی شخصیت وسیرت، عادات واخلاق، ادبی ومعاشرتی زندگی سے واقف کرانے کے لیے رشید احمد صدیقی کا ایک طویل اقتباس پیش کیا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم پر لکھے گئے اس خاکے میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں سے ہی واقفیت نہیں ہوتی بلکہ اس دور کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور ادبی زندگی سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔

**پکچر گیلری کی ایک تصویر (شاہد احمد دہلوی)**

اس مضمون نما خاکے میں شاہد احمد دہلوی کی شخصیت کا صرف ایک پہلو بطور مدیر ساقی ہمارے سامنے آتا ہے۔ باقی قرۃ العین حیدر نے خود اعتراف کیا ہے کہ شاہد احمد دہلوی سے ان کی ملاقات سرسری سی تھی۔ اس لیے وہ ان کی شخصیت سے روشناس کرانے سے قاصر ہیں۔ اس میں انھوں نے شاہد احمد دہلوی سے متعلق جو بھی واقعات بیان کیے ہیں ان میں مصنفہ کا کردار مرکزی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے اور صاحب خاکہ ایک ضمنی کردار کی طرح ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ مصنفہ نے اس مضمون میں اپنی افسانہ نگاری کی شروعات سے متعلق دلچسپ واقعات قلم بند کیے ہیں اور ساتھ ہی اپنی افسانہ نگاری پر کیے جانے والے اعتراضات جیسے بورژوا سوسائٹی کلب کلچر، مغربیت زدگی، انگریزی الفاظ کے غیر ضروری استعمال وغیرہ کا جواب دیا ہے۔

> ''اس زمانے میں، میں جس قسم کے افسانے لکھ رہی تھی، وہ موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے شاید اپنے وقت سے ذرا آگے تھے۔ جس ''اوپری طبقے'' کے پس منظر کے ساتھ میں نے کہانیاں لکھیں، وہ طبقہ تقسیم ہند سے قبل معاشرے کے مٹھی بھر افراد تک محدود تھا۔ میں نے اسی طبقے میں آنکھیں کھولیں اور لامحالہ اسی کے بارے میں لکھا قاریوں کی اکثریت کو وہ افسانے بے حد انوکھے اور عجیب معلوم ہوئے اور عام تنقید یہ تھی کہ میں کسی دوسرے کُرے کی باتیں لکھتی ہوں لیکن تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں میں دولت وعشرت کی فراوانی اور افراطِ زر کی وجہ سے وہ ''انوکھی'' زندگی اب بے حد عام ہوگئی۔ آج کے متعدد لکھنے والے اور قاری خود ایک نئے ''اوپری طبقے'' میں شامل ہیں اور بہر حال ''کلب''، ''کانونٹ'' وغیرہ اب کوئی عجوبۂ روزگار بات نہیں رہی جب کہ ہر چوتھے افسانہ نگار کی کہانیوں کا پس منظر اب یورپ یا امریکہ ہے۔ (مزید برآں آج کل متعدد افسانہ نگار خواتین وحضرات محض اسی قسم کے افسانے لکھ رہے ہیں۔ جیسے میں نے شروع شروع میں لکھے تھے یا میرے اولین افسانوں کا چربہ اتارا جارہا ہے تو کسی کو اچنبھا نہیں ہوتا نہ ان افسانہ نگار خواتین کے متعلق حماقت آمیز قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں میں بوجہ کم عمری وکم عقلی اپنے افسانوں میں انگریزی الفاظ استعمال کرتی تھی۔ اس پر خوب لے دے ہوئی۔ آج کل چند نامور

''افسانہ نگار انگریزی الفاظ بے تحاشا اور اکثر غلط اور بلا ضرورت اپنی کہانیوں اور مضامین میں استعمال کر رہے ہیں اور ان پر قطعی اعتراض نہیں کیا جاتا!''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ: 92)

یہاں موضوع یا صاحبِ خاکہ مرکز نظر نہیں ہیں۔ اس پکچر میں کیمرہ کا فوکس Object سے ہٹ کر جزئیات پر آ گیا ہے جس کی وجہ سے صاحبِ خاکہ کی تصویر دھندلی اور دور کہیں پس منظر میں نظر آتی ہے۔

**چاند نگر کا جوگی (ابن انشاء)**

چاند نگر کا جوگی اردو کے مقبول طنز و مزاح نگار و شاعر ابن انشاء کا خاکہ ہے۔ خاکہ کا عنوان قرۃ العین حیدر نے ابن انشاء شاعری ہی سے اخذ کیا ہے۔ چاند نگر ابن انشاء کی تخلیقی کائنات ہے اور جوگی وہاں کا باسی جس کا نگر میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ یہ خاکہ اس مجموعے کے دوسرے خاکوں کے مقابلے میں فنِ خاکہ نگاری کے اصولوں پر پورا اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مصنفہ نے اس میں ابن انشا کا سراپا بیان کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی ثنویت کو ان کے خلق کردہ شعری کرداروں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

''موٹے شیشوں کی عینک لگاتے، دراز قد، نہایت بھلے اور نیک دل آدمی بے حد سنس آف ہیومر کے مالک اور انتہائی شائستہ، چاند نگر کے ''بنجارے'' ''جوگی'' اور اصلی ابن انشاء دو مختلف ہستیاں تھیں۔ انسان کی ظاہری شخصیت اور اس کے دنیاوی کاروبار اور اس کی ذاتی کائنات میں کتنا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس ثنویت کی ایک مثال ابن انشاء تھے جن کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ: 112)

قرۃ العین حیدر نے ابن انشاء کو ثنویت dual personality کا حامل قرار دیا ہے۔ جس کی طرف ابن انشاء کے دوست واحباب نے بھی الگ الگ تحریروں میں اشارے کیے ہیں۔ شاعری انھوں نے سنجیدہ کی، ان کے پیش کردہ کرداروں، بنجارہ اور جوگی میں قارئین شاعر کا عکس دیکھنے لگے۔ لیکن ابن انشاء کی شخصیت ان کرداروں سے بالکل متضاد تھی۔ وہ بذلہ سنج تھے۔ ان کی حسِ مزاح کا اصلی رنگ ان کے سفرناموں اور مضامین میں دکھائی دیتا ہے۔

اس خاکے میں قرۃ العین حیدر نے اس عہد کے پاکستانی ادبی منظر نامہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اچھے ادب کی تخلیق کے لیے قلم کاروں کا معاشی طور پر متمول ہونا بہت ضروری ہے۔ مغرب کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہاں ادب اور ادیب دونوں کی قدردانی وقت پر ہوتی ہے۔ معاشی خوشحالی ہو تو قلم کار بے فکر ہو کر یکسوئی سے فن کی تخلیق میں جٹ جاتا ہے جب کہ فکر معاش شاعر و ادیب کو مضطرب و منتشر رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تیسری دنیا کے ادیبوں کی خستہ حالی ان کے ادب کو بھی متاثر کر رہی ہے۔ ذاتی فرسٹریشن، ذاتی بغض و عناد، رشک و حسد، مخالفت و مخاصمت ادب میں در آتی ہے جس کے سبب عظیم ادب کی تخلیق ناممکن ہو جاتی ہے۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ ایسے میں دو قسم کا ادب پیدا ہو سکتا ہے، ایک انقلابی اور دوسرا سیاست پرست اور ادیب آہستہ آہستہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ بصیرت افروز تجزیہ شخصی تجربات اور گہرے مشاہدے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ ابن انشاء نے اپنی شاعری میں پنگھٹ، جوگی اور من مندر کی ہندوستانی امیجری کو پیش کر کے تخلیقی تجربے کے ذریعے ایک مخصوص زبان اور لہجے کو دوبارہ دریافت کیا ہے۔ وہ ابن انشاء کو ہیومنسٹ سوشلسٹ قرار دیتی ہیں۔ ابن انشاء گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ ہیں۔ ان کے پاس ہندوستانی امیجری ان کے ناسٹلجیا، اس گزرے ہوئے ماضی کی یادگار ہے جسے ان کی تخلیقی بازیافت نے طاق نسیاں ہونے سے بچا لیا۔ ابن انشاء کی شاعری میں چاند مختلف الجہات علامت کی حیثیت رکھتا ہے اس کی معنوی جہتیں تکرار کے باوجود بور نہیں کرتیں۔

قرۃ العین حیدر نے ابن انشاء کی شاہکار تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' کو طنز و مزاح میں ''1066 and all that'' کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس کے کچھ حصے انھوں نے ترجمہ کر کے السٹرٹیڈ ویکلی میں شائع بھی کروائے تھے۔

مصنفہ نے ابن انشاء کی بذلہ سنجی کے حوالے سے ان کے خطوط کے نہایت دلچسپ اقتباسات پیش کیے ہیں۔ وہ ابن انشاء کے طنز و مزاح میں معیار کو ان کی تہذیب کی نشانی قرار دیتی ہیں۔ ابن انشاء کے مزاج کی یہ شگفتگی ان کی زندگی کی آخری گھڑیوں تک بھی باقی رہی۔ مرنے سے ایک دن پہلے انھوں نے ''بیمار کا حال اچھا ہے'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھا۔

ابن انشاء کی شاعری کے حوالے سے مصنفہ نے ان کا ایک اقتباس شامل کیا ہے جس سے ان کی شعری کائنات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی طمانیت کے لیے شاعری کرتے تھے۔

''بہر حال ظاہری حقیقت یہی ہے کہ میں اپنے اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر لکھتا ہوں۔ شعوری طور پر نہ کسی نقاد کے

لیے لکھتا ہوں نہ عوام کے لیے۔ میری وہ نظمیں جن میں صحت مند سماجی شعور ملتا ہے ،شعوری طور پر مقصدی نہیں ہیں ۔۔۔شاید یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان میں جبلی کمزوریاں ،یاسیت اور فرار جگہ پا جاتی ہیں میرے نزدیک دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں اسی طرح رہنے دیا جائے۔''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:121)

اس خاکے میں قرۃ العین حیدر نے جدید تنقیدی رویوں پر بھی طنز کیا ہے۔

**مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی**

اس مضمون نما خاکہ کے مطالعہ کے بعد قاری کو یہ واقفیت حاصل ہوتی ہے کہ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ایک منکسر المزاج ،فرومایہ ،غیور اور خوددار انسان تھے ضعیفی اور زمانے کی ناقدری کی جھلاہٹ ان کے مزاج میں مفقود تھی۔ شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود شہر کے اہم ادبی جلسوں اور تقاریب میں ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے۔

ان کی تصنیف ''دین الٰہی اور اس کا پس منظر'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ مصنفہ کی ایما پر اس کتاب کو مولانا نے ایک ادارے کے سالانہ انعام کے لیے داخل کیا تھا۔ لیکن کتاب کو کوئی انعام نہیں ملا اور بعد میں پتہ چلا کہ جج صاحبان نے اس کتاب کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ مصنفہ مولانا کو ہماری ادبی اور علمی Dichotomy کی روشن مثال قرار دیتی ہیں۔ وہ سماجی لحاظ سے اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جنھیں ''لائم لائٹ'' آسانی سے مل جاتی ہے۔

جدید تنقیدی رجحانات میں ایک رجحان مابعد نو آبادیاتی تنقید کا ہے۔ جس میں سامراجیت کا شکار رہے ممالک کے ادب کا تجزیہ اس خاص نفسیاتی وذہنی رویوں کے سیاق وسباق میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزیت کا غلبہ مفتوح ومحکوم قوم کی احساسِ کمتری کی نشانی ہے۔ آج بھی انگریزی زبان کو جو فوقیت حاصل ہے وہ ہندوستان کی کسی اور زبان کو حاصل نہ ہو سکی۔ جس کے سبب مقامی زبانوں کے قلم کاروں کو وہ قدر ومنزلت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس خاکے میں مصنفہ نے ادبی سیاست اور اداروں کی جانب سے دیے جانے والے انعامات میں انتخاب کے طریق کار پر لطیف طنز کیا ہے کہ کمیٹی کے اراکین انعام کے لیے داخل کی گئیں کتابیں پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

**''کچھ عزیز احمد کے بارے میں''**

آزادی کے بعد پاکستان میں تہذیبی شناخت کا مسئلہ ادبی گروہ بندی کا سبب بنا۔ ایک طرف اردو کا گنگا جمنی مزاج، ادبی تاریخ ،مشترکہ تہذیب کا پروردہ ادب اور دوسری طرف نئے اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں، پاکستانی اور اسلامی ادب کا نعرہ گونجنے لگا۔ ترقی پسند اور اسلامی ادب کے دو کیمپ بن گئے تھے۔ ان میں معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ ایسی فضا میں عزیز احمد اپنے تخلیقی اسٹائل کے ساتھ اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ 1958 میں انگلینڈ منتقل ہو گئے اور درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔

عزیز احمد پر یہ اعتراضات ہوتے رہے کہ وہ اپنے شناساؤں کی زندگی اور واقعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ عزیز احمد ہر طرح کی تنقید کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے۔ جو ان کی ذہنی اور جذباتی پختگی کی ایک علامت ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی ان کے فن کی معترف اور قدرداں نظر آتی ہیں اور اس بات پر افسوس اور تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ نقادوں نے عموماً انھیں نظر انداز کر دیا۔

عزیز احمد نے مغرب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ حیدر آباد میں شہزادی درشہوار کے پرائیوٹ سیکریٹری تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ قرۃ العین حیدر باتوں باتوں میں اردو میں تنقید اور سکہ بند تنقیدی نظریات پر سخت طنز کرتی ہیں۔ شاعری کے مقابلے میں فکشن پر بہت کم تنقید لکھی گئی ہے اور خواتین کی ابتدائی کاوشوں کو تو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً حجاب امتیاز علی کے حوالے سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔

''اس اسٹریوٹائپ تنقید کا ایک وصف یہ ہے کہ مثلاً رومانی دور میں کوئی چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ لکھی گئی ہو، اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے گا۔ اپنے عروج کے زمانے میں ترقی پسندوں نے بہت سوں پر یہ لیبل چپکا کر انھیں راندہ درگاہ قرار دیا۔ مثال کے طور پر ایک حجاب امتیاز علی کو لیجیے جن کو نہ صرف فراموش کر دیا گیا بلکہ برسوں ان کے اسٹائل کی پیروڈی کی گئی۔ حجاب کا ایک بہت اچھا ناول ''ظالم محبت'' 1941 میں چھپا تھا۔ اس سے بھی پہلے غالباً 1932 میں ''میری ناتمام محبت'' شائع ہوا تھا جسے اردو میں لطیف Sensibility کے موڈرن ناولوں کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ مگر کسی تذکرے میں ان ناولوں کا ذکر کیا جاتا ہے؟ پرانے ادیبوں کو محض Perod Piece سمجھ کر ایک سرپرستانہ رویئے کے ساتھ ادبی میوزیم میں داخل کر دینا صرف ہمارے ہاں ہوتا ہے۔''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:102)

اس خاکے میں بھی قوسین میں قرۃ العین حیدر کے اردو میں تنقیدی

رویوں کی مذمت کرتے ہوئے آگ کے دریا پر آواگون کے فلسفے پر مبنی ہونے کے اعتراض کا جواب دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ ناول قطعاً آواگون کے فلسفے پر مبنی نہیں ہے۔

عزیز احمد کا ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور رسوا کے ''امراؤجانِ ادا'' یونیسکو کی طرف سے ترجمہ ہوکر شائع ہوا تھا۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ عزیز احمد کے ناول اردو کے بہترین ناولوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

ان خاکوں میں قرۃ العین حیدر کی علمیت، دانشوری، تاریخی شعور، ادبیاتِ عالم کا مطالعہ کا رنگ کبھی کبھی اس قدر غالب آجاتا ہے کہ صاحبِ خاکہ کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے۔

اس خاکے میں مصنفہ نے ایک نہایت اہم پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے کہ عظیم ترین مشرقی شعرا و ادبا کو مغرب میں وہ قبولیت اور مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوئی؟ عینی یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ مشرق و مغرب کے ذہنوں کے درمیان زبردست ترسیلی خلیج حائل ہے۔ وہ عزیز احمد کے افسانے ''تصورِ شیخ'' کی مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ انگلستان یا امریکہ کے قاری کے لیے یہ بے معنی ہوگا۔ اس طرح اچھا مشرقی ادب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

> ''عزیز احمد اور ہم آپ تو خیر بونے لوگ ہیں۔ رومی، غالب اور اقبال کو اسی ترسیلی خلیج کی وجہ سے وہ عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:107)

قرۃ العین حیدر نے عزیز احمد کے ناولوں اور افسانوں کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کے بعد عزیز احمد اردو کے دوسرے ادیب ہیں جنھوں نے مغرب کو اپنا موضوع بنایا۔ فنی اور فکری سطح پر مغربی فضا اس عہد میں ایک نئی چیز تھی۔ عزیز احمد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ لکھنے کی فطری صلاحیت کے علاوہ فکری پختگی، تہذیب اور تربیت یافتہ ذہن کا اثر ان کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ ''گریز'' اور ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے بعد ان کا فن اور بلندی پر پہنچ سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے ناول نگاری سے گریز کرتے ہوئے کوئی اور راہ اختیار کرلی۔ ہجرت کے بعد پاکستان میں سرکاری ملازمت ملی۔ وزارت اطلاعات ونشریات میں وہ قرۃ العین حیدر کے رفیق کار رہے۔ اس زمانے کی ادبی صحبتوں، علمی مباحثوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں سے عزیز احمد لندن چلے گئے اور اورینٹل اسکول میں پڑھانے لگے۔ پھر کچھ عرصے بعد کینیڈا منتقل ہوگئے اس دوران انھوں نے اسلامیات اور تصوف کے موضوع پر متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں۔

**داستان طراز محمد علی رودلوی:**

اس مضمون میں مصنفہ محمد علی رودلوی کی علمیت اور اسلوب کی قدر داں ہی نہیں بلکہ ایک حد تک مرعوب نظر آتی ہیں۔ محمد علی رودلوی اس دور کے پروردہ ہیں جہاں دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ پیچھے سنہرا ماضی تھا حال بے حال اور مستقبل خدشات میں گھرا ہوا تھا۔ محمد علی رودلوی اس عوامی کلچر جس کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان روایات پر رکھی گئی تھیں اسی تہذیب اور اقدار کے نام لیوا تھے۔

> ''انگریزی ادب، مغربی آرٹ و فلسفہ وغیرہ پر ان کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک وسیع ہے۔ ہندو اپشندوں اور کارل مارکس دونوں میں یکساں دلچسپی رہی۔ نہایت عمدہ انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔'' (پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:76)

مصنفہ کا کہنا ہے کہ محمد علی رودلوی نے پریم چند کی طرح کسانوں اور نئے پرولتاریہ کا ساتھ دیا۔ وہ پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ ان کی فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''اردو افسانے میں جو طرزِ بیان، برجستگی، شوخی اور بانکپن محمد علی اپنے ساتھ لائے میں نے اور کہیں نہیں لکھا تھا کہ وہ اتنا انوکھا اور منفرد ہے کہ کوشش کر کے بھی اس طرح کی دو سطریں نہیں لکھی جاسکتیں۔ انداز بیان اتنا فطری ہے کہ جب دفعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ قصہ گو یہ واقعہ اپنے مخصوص انداز میں خود اپنی زبان سے نہیں سنا رہا تھا بلکہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے تو عجیب سا لگتا ہے۔'' (پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ:79)

چودھری محمد علی نے داستان گوئی میں حقیقی زندگی اور عصری حسیت کو شامل کر کے ایک نیا انداز اختراع کیا تھا۔ اپنی آس پاس کی زندگی سے وہ کردار لیتے تھے۔ ان کی کمزوریاں، ان کی نیکیاں، ان کی معصومیت سب اوریجنل ہوتے جس کی وجہ سے ان کی تحریریں عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتیں۔

مصنفہ نے ان کے مذہب سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ان کی وسیع النظری، روشن خیالی اور عقلیت پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد علی رودلوی آزادیِ نسواں کے شدید حامی تھے۔ اپنی بیٹیوں کو کرامت حسین کے قائم کردہ اسکول میں انگریزی کی تعلیم دلوائی۔ عمر بھر اپنی وضع داری پر قائم رہے رودلوی چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔

چودھری محمد علی فن قصہ گوئی اور لطیفہ گوئی میں ماہر تھے۔طبعی بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔مصنفہ نے صاحبِ خاکہ کی بیٹی کے حوالے سے ایک واقعہ قلمبند کیا ہے جس سے محمد علی رودلوی کی شگفتہ بیانی اور حسِ مزاح کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے۔

''ایک واقعہ سنایا کہ چند روز ہوئے وہ حضرت گنج میں گزر رہے تھے۔راستے میں چند جاننے والے نوجوان لڑکے مل گئے۔ان کے ساتھ کچھ دیر ایک قہوہ خانے میں جا کر بیٹھے۔ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔جوانی کی جھلک دیکھی۔اپنا بڑھاپا بھولے۔پھر لڑکے اپنی راہ چلے گئے۔سامنے سے ایک بوڑھا آتا نظر آیا۔خیال آیا کہ اب پھر بڑھاپا دکھائی دیا۔۔۔بڑی کوفت ہوئی کہ اب دو گھڑی رک کر ان سے ملنا پڑے گا۔صورت آشنا معلوم ہوتے ہیں۔لیکن جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ان سے ملیں۔بادلِ ناخواستہ ان کی طرف بڑھے۔دو قدم قریب پہنچ کر دیکھا تو سامنے قدِ آدم آئینہ تھا۔''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ: 84)

قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال نہایت بے ساختگی و برجستگی سے کرتی ہیں۔اس مجموعے کے خاکوں میں انھوں نے انگریزی محاوروں اور مقولوں کو اردو میں ترجمہ کے ذریعے ہلکی سی ترمیم و اضافت کے ساتھ منتقل کیا ہے۔جیسے

رفیق فلاسفر Friend Philosopher & Guide اور انجمن توصیفِ باہمی Mutual Admiration Society وہ کلیشے الفاظ اور Swipping Statements کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔

''ملک میں ایک نیا دور'' (نہایت بے ہودہ لفظ ہے) مطلب یہ کہ ایک عہدِ نو (لاحول ولا قوۃ) شروع ہو چکا تھا''

(پکچر گیلری: قرۃ العین حیدر، صفحہ: 57)

ان خاکوں میں قرۃ العین حیدر کی نسائی حسیت احتجاجی رویہ اختیار کر لیتی ہے اور ناقدین ادب سے سوال کرتی ہیں کہ ادب میں خواتین قلم کار کی کاوشوں کو کیوں سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔

ان کی تحریروں میں طنز کی زیریں لہر موجود ہوتی ہے۔ جڑوں کی تلاش، تہذیبی ورثے کے کھو جانے کا ملال ان کے ناول اور افسانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر افسانوی ادب سے متعلق اصناف جیسے خاکہ، رپورتاژ، خطوط وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔وہ تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑ کر انسان اور انسانیت کے عروج و زوال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان خاکوں میں قرۃ العین حیدر نے ذاتی معلومات، چشم دید واقعات، نجی تجربات، صاحب خاکہ پر لکھی گئی دیگر تحریروں، ان کے خطوط اور ان کی شعری و نثری تصنیفات سے مواد حاصل کیا ہے، خصوصاً ابن انشاء اور یلدرم کے خاکوں میں۔

ایک خاکہ پڑھنے کے بعد قاری صاحب خاکہ سے روشناس ہوتا ہے۔ان کی شکل و صورت، قد و قامت، لباس و پوشاک، مزاج و مذاق، عادات و اطوار، معمولات و مشاغل، امتیازات و خصوصیات اور افکار و نظریات سے واقف ہوتا ہے۔لیکن قرۃ العین حیدر کے ان خاکوں میں شخصیت شناسی کے ساتھ ساتھ مختلف علمی و ادبی مباحث بھی زیر بحث آ جاتے ہیں جس کے سبب ان پکچرس کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب کی امتیازی خصوصیات میں شعور کے رو کی تکنیک اور ان کا تاریخی شعور ان خاکوں میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔واقعہ نگاری اور منظر نگاری میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔زبان و بیان کی ادبیت اور طرز اسلوب کی انفرادیت پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال جیسی تکنیک کے استعمال کے سبب غیر افسانوی ادب بھی افسانوی ادب کے دائرے میں شامل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔زماں و مکاں کے فاصلے مٹتے چلے جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے اکثر مضامین خاکہ نگاری کے تقاضے کو پورا نہیں کر پاتے۔انھوں نے شعوری اور دانستہ طور پر خاکہ نگاری کے لیے قلم نہیں اٹھایا۔اگر وہ خاکہ نگاری کے ارادے سے قلم اٹھاتیں تو بے حد عمدہ خاکے معرضِ وجود میں آ سکتے تھے۔لیکن انھوں نے یہ مضمون نما خاکے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لکھے ہیں۔تاثراتی و سوانح قسم کے یہ خاکے مشاہدات و واقعات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔بہرحال اردو کی معروف شخصیات پر لکھے گئے یہ خاکے اپنی نوعیت کے منفرد، دلچسپ اور معلوماتی خاکے ہیں جو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ایک اختراعی ذہن رکھنے والا بڑا فنکار جس صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے اس کے اصول خود وضع کرتا ہے۔

□□□

**Dr. Bibi Raza Khatoon**
Assistant Professor
Dept. of Urdu, MANUU
Urdu University Road, Near LNT Towers,
Telecom Nagar, Gachibowli
Hyderabad-500 032 (T.S)

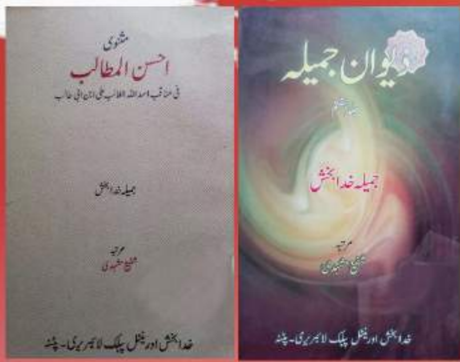

ڈاکٹر شاہد ساز

# جمیلہ بیگم
## ایک صاحبِ دیوان شاعرہ

نام راضیہ خاتون اور تخلص جمیلہ تھا لیکن شاعری کے ابتدائی دور میں راضیہ اور خاتون تخلص کرتی تھیں۔ جمیلہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ فصیح الدین بلخی نے ''تذکرۂ نسوان ہند'' میں جمیلہ کا سنہ پیدائش 1868 درج ہے۔ وہاب اشرف نے ''تاریخ اردو ادب'' میں 1868 ہی لکھا ہے لیکن شفیع مشہدی نے اصل ماخذ سے یہ ثابت کیا ہے کہ جمیلہ کی پیدائش 1861 ہے۔ اس کے علاوہ فصیح الدین بلخی نے ''تذکرۂ نسوان ہند'' میں جمیلہ کے والد کا نام خان بہادر مولوی یحییٰ علی رئیس کلکتہ لکھا ہے جبکہ جمیلہ کے دیوان ''نغمۂ دل رئیس از جمیلہ درویش'' کے سرورق پر والد کا نام شمس العلماء مولوی کبیر الدین احمد درج ہے:

> ''سیف مسلول فی غزوات الرسول'' از مسماۃ بی بی راضیہ بیگم صاحب متخلص بہ خاتون بنت شمس العلماء مولوی کبیر الدین احمد صاحب مرحوم وزوجہ مبارکہ عالی جناب معلّی القاب خان بہادر مولوی خدا بخش صاحب وکیل۔''

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جمیلہ کے والد کا نام خان بہادر مولوی یحییٰ علی رئیس نہیں بلکہ شمس العلماء مولوی کبیر الدین احمد تھا۔ مولوی کبیر الدین بنگالی مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کی مادری زبان بنگلہ تھی لیکن اس کے باوجود عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ کلکتہ میں آپ کا مکان کمیدان بگان لین میں تھا۔ 1872 میں کلکتہ کے جسٹس آف پیس ہوئے۔ اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ممبر بھی تھے۔ موصوف مشہور مطبع ''مظہر العجائب'' کے مالک تھے۔ اس مطبع سے اردو انگریزی اخبار ''اردو گائیڈ'' چھپتا تھا۔ چند سال کے بعد اس کا نام تبدیل ہوکر ''اردو گائیڈ'' ہوگیا۔ اس مطبع سے چند مشہور کتابیں چھپی تھیں جن میں ''امیر نامہ''، ''بیرنگ نامہ''، ''منتخب مثنویات سودا''، ''اردو معلے'' اور ''اردو لغت'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں مسلم معاشرہ میں عورتوں کو تعلیم دینا دور کی بات، بلکہ انھیں سات پردوں میں رہنا پڑتا تھا لیکن جمیلہ کو اپنے والد کی سرپرستی کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتی ہیں:

> ''شرفا کے یہاں لڑکیوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے میں بھی محروم نہ رہی۔ قرآن شریف اور اردو میں چند مذہبی کتابیں، یہی وہ ذخیرۂ علم تھا جو میکے سے لے کر سسرال کو چلی۔''

(دیوان جمیلہ، مرتب: شفیع مشہدی، جلد دوم ص: 21، 2004)

جمیلہ کو ابتدائی تعلیم اپنے والد کی وجہ سے حاصل ہوئی لیکن سسرال میں انھیں اپنے شوہر مولوی خدا بخش کی وجہ سے پڑھنے کا نادر موقع ملا۔ پروفیسر وہاب اشرفی، جمیلہ کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جمیلہ مولوی خدا بخش کی تیسری بیوی ہیں لیکن محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ خدا بخش کی آخری بیوی تھیں لیکن جمیلہ اپنی خودنوشت سوانح میں یوں لکھتی ہیں:

> ''سسرال پہنچ کر نئی سے پرانی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مجھ سے سوت پروری کی فرمائش کی گئی۔ شوہر کی رضا جوئی یا اطاعت فرض تھی۔ میں اٹھی اور خود جاکر بی صاحبہ کو لے آئی اور انتظام خانہ داری ان کے سپرد کردیا۔''

(ایضاً، ص: 21)

جمیلہ کی شاعری کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان کے شوہر مولوی خدا بخش نے گہری دلچسپی لی۔ شاد عظیم آبادی اور داغ دہلوی سے ان کے کلام پر اصلاح دلواتے تھے۔ موصوف نے جمیلہ کو ستار بجانے کی بھی تعلیم گھر پر دلوائی۔

''کلیاتِ شاد'' میں کلیم الدین احمد نے شاد عظیم آبادی کے تلامذہ میں جمیلہ بیگم کا نام کیوں شامل نہیں کیا جبکہ شاد عظیم آبادی، اپنے ایک خط میں جمیلہ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''آج دو برس سے ہر اتوار کے دن صبح کو خدا بخش خاں صاحب اپنی بیوی کی غزلیں لایا کرتے ہیں۔ کھانا وغیرہ یہیں کھاتے اور سہ پہر کو جاتے ہیں۔''

''دیوان جمیلہ'' جلد ہشتم میں جمیلہ کا ایک قطعہ شاد عظیم آبادی کی مدح سرائی میں اور ایک خط میں انھوں نے اپنی شاگردی کے بارے میں لکھا ہے:

''میں بنگالہ کی رہنے والی کہاں اور اردو شاعری کہاں؟ آپ کی توجہ سے شاعرہ بن گئی ...... آپ کی عنایت نے مجھے بلند نام کیا۔''

قطعہ ملاحظہ ہو:

اے شاد شک نہیں ہے کہ استادِ فن ہے تو
اور عندلیب گلشن شعر و سخن ہے تو
غالب ہے اپنے وقت کا راسخ ہو یا کہ میر
اس میں نہیں کلام کہ فخرِ وطن ہے تو
اے شاد، شاعری میں ترا مثل ہے کہاں
حالی عصر، میر سا صاحب سخن ہے تو
آئی نہیں خزاں کبھی گلشن میں علم کے
جس میں سدا بہار ہے، بس وہ چمن ہے تو
تیرا نہیں جواب سخن آوروں میں ہے
ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ فخر زمن ہے تو
شاعر بہت ہیں پر نہیں تجھ سا کوئی کہیں
پروانے سب ہیں، روشنی انجمن ہے تو
کیا اے جمیلہ مدح کرے گی تو شاد کی
تجھ میں کہاں مجال کہ بستہ دہن ہے تو

(دیوان جمیلہ، جلد ششم، ص:307، 2006)

داغ دہلوی کے متعلق اپنے تاثرات ایک شعر میں بیان کرتی ہیں:

اے جمیلہ خون رلایا ہے غم استاد نے
داغ دل میں صورت اختر نمایاں ہے

(دیوان جمیلہ: جلد پنجم)

جمیلہ نے حضرت سیدنا و مولانا سید شاہ مرشد علی قادری، شاد عظیم آبادی، داغ دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ سید شاہ مرشد علی قادری صاحب دیوان شاعر تھے۔ عاصی اور جمال تخلص کرتے تھے۔ جمیلہ ابتدا میں راضیہ اور خاتون تخلص کیا کرتی تھیں لیکن اپنے پیر و مرشد کے کہنے پر انہوں نے اپنا تخلص جمیلہ اختیار کیا۔ موصوف اپنے تخلص کے متعلق خود فرماتی ہیں:

''ہمارے پیر و مرشد قدس سرہٗ جو اشعار میں جمال تخلص فرماتے تھے ایک دن مجھ سے فرمانے لگے تم ہماری مرید ہو، تمہارے سوا ہماری کسی مرید میں شاعری کی لیاقت نہیں، اس لئے میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنی غزلوں میں اپنا تخلص جمیلہ کیا کرو۔''

(خودنوشت سوانح حیات: دیوان جمیلہ، جلد دوئم مرتب: شفیع مشہدی 2004ص:23)

جمیلہ نے سید شاہ مرشد علی قادری کی شاعری کی تقلید کی۔ انہیں اپنے پیر و مرشد سے بے انتہا عقیدت و محبت تھی اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے دیوان میں ان کی مدح سرائی کر کے کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے جمیلہ، شعر گوئی ہے عنایت پیر کی
جو لب مرشد سے نکلا وہ مرا مضمون ہوا

مداحِ دل و جان سے میں جس کی ہوئی ہوں
وہ پیر میرا نامِ خدا نورِ خدا ہے

یہ عنایت تھی تری مرشد علی القادری
اولیاؤں میں جو شامل مجھ سا کمتر ہوگیا

ادنیٰ سی عنایت سے مرشد کی جمیلہ میں
ہوں میر کا اب ثانی استاد جو فن کا تھا

مرنے کی آرزو نہ جمیلہ ہو کس لیے
مرکر ملیں گے حضرت مرشد علی سے ہم

غرض جمیلہ کی شاعری کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے وہ خدا بخش خاں کی وجہ سے ہے ورنہ جمیلہ بھی دوسری شاعرات کی طرح گمنامی کا شکار ہوتیں۔

جمیلہ ایک مشاق شاعرہ تھیں۔ ان کے اندر شعر گوئی کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ اشعار لکھتی نہیں تھیں بلکہ شعر خود ان پر نازل ہوا کرتے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے متعلق اپنی خود نوشت سوانح میں رقم طراز ہیں:

''گھر کرنے سے سبکدوش ہونا تھا کہ شوق کتب بینی از سرنو چرایا..... ایک بہن کی ملاقات کو جانا ہوا۔ انہوں نے مجھے ایک غزل دکھا کر کہا کہ دیکھو میں نے اسے تصنیف کیا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا ہے کہ ان کے شوہر نے یہ غزل کہہ کر بی بی کے نام کا مقطع لگا دیا ہے۔ بہر کیف بہن کی غزل نے میرے دل کو طومار حسرت بنا دیا۔ یہی خیال رہ رہ کر ستاتا تھا کہ آخر تو نے بھی تو کچھ شد بد کر لیا ہے، تو بھی غزل لکھ سکتی ہے پھر لکھتی کیوں نہیں؟ اسی ادھیڑ بن میں واپس آئی۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، کاغذ و پنسل اٹھا کر تک بندی شروع کر دی۔ نہ شعر کے دم کی خبر تھی نہ سم کی۔ جو جی میں آیا بے تکی اڑانا شروع کر دی۔ پھر کیا تھا یاروں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ جس نے سنا ہنس دیا۔ لوگوں کو چھیڑنے کا موقع ہاتھ آیا مگر بندی کے پاپوش کو بھی خبر نہ ہوئی۔ میرے سر پر ایسا ویسا جن تو سوار ہوا نہ تھا جو معمولی سی ہنسی ٹھٹھے سے اتر جاتا۔ نہ سوت کا صدمہ نہ خانہ داری سے دست برداری کا رنج۔ کاغذ، پنسل اور میں۔ رفتہ رفتہ تک بندی نے جامہ شاعری پہننا شروع کیا۔ اسی زمانے میں پیرو مرشد جناب مولانا حضرت شاہ مرشد علی صاحب جیلانی و بغدادی قدس سرہ کے ہاتھوں پر مرید ہوئی۔ مرشد کی توجہ میرے حال پر ایسی کچھ ہوئی کہ..... غزلوں کا لکھنا آسان سے آسان کام نظر آنے لگا۔ بقول شخصے:

ع بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

اللہ کی کبریائی کے صدقے اب وہی حضرات جو ہماری تک بندیوں پر ہنستے تھے، غزلوں کو بچشم حیرت دیکھنے اور سچی تعریفیں کرنے لگے۔ نہ میں نے کسی کو غزل لکھتے دیکھا نہ کہتے سنا۔ نہ بحر رجز سے واقف نہ بحر رمل سے۔ پھر یہ کس چیز کی داد دیتے ہیں۔ فاعلات فاعلات تو میں اس وقت تک نہیں جانتی۔ غرض میری شاعری کو امداد الٰہی یا فیضان قادریہ عالیہ یا کرامت مرشدی سمجھیے۔''

جمیلہ نے آٹھ دواوین، ایک مثنوی، ایک موسیقی اور ایک جغرافیہ پر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار شفیع مشہدی نے ان کے دواوین کو مرتب کیا ہے جسے خدا بخش لائبریری نے شائع کیا۔

دیوان جمیلہ (جلد اوّل)

| | | |
|---|---|---|
| سن اشاعت: 2003 | | صفحات: 312 |
| (1) | حرف آغاز | 2 صفحات |
| (2) | جمیلہ خدا بخش: ایک تعارف | 12 صفحات |
| (3) | جمیلہ خدا بخش: خودنوشت سوانح حیات | 3 صفحات |
| (4) | دیوان دلِ ریش از جمیلہ درویش | 3 صفحات |

شفیع مشہدی، دیوان جمیلہ (جلد اول) کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دیوان پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ جمیلہ نے اسے کب مرتب کیا تھا مگر چند حقائق سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ خدا بخش خاں مرحوم 1898 میں جمیلہ کے ساتھ حیدر آباد سے پٹنہ واپس آئے تھے اور اسی کے بعد ان پر فالج کا دورہ پڑا اور علالت و عسرت کا ایک افسوسناک سلسلہ شروع ہوا۔ 1903 میں کتب خانہ کے ناظم مقرر ہونے کے بعد ان کی مالی پریشانیوں میں کمی ضرور آئی مگر پریشانیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان افسوسناک حالات کا ذکر جمیلہ کے اشعار میں ملتا ہے اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس دیوان کو اس کے بعد مرتب دیا گیا ہوگا۔ 1921 میں جمیلہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ لہٰذا 1903 سے 1921 کے درمیان یہ مرتب ہوا ہوگا۔

دیوان جمیلہ (جلد اوّل) میں 306 غزلیں موجود ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدا

ہوا ہے مدبسم اللہ غازہ تیری وحدت کا
بنا کیا خوب طغرا ہے یہ منشور سعادت کا
ہوئی ہے آیت الحمد سے رحمت تری ظاہر
نہیں ہے اب ترے بندوں کو کچھ کھٹکا قیامت کا
رسول ہاشمی جلوہ ہے تیرے نور اقدس کا
سہارا عاصیوں کو ہوگیا ان کی شفاعت کا
نہیں ہے نامۂ اعمال کی پروا مجھے باقی

مجھے ہے آسرا اس حامیٔ دیں کی حمایت کا
نہیں ہے خوف خاتون، میرے دل میں حشر کے دن کا
قدم چومیں گی اپنے شافعِ روزِ قیامت کا
اختتام

دل ہی نہ ہوتو حسرت و ارمان کیا رہے
گھر ہی نہیں رہا ہوتو مہماں کیا رہے
ہیں رنگ ڈھنگ ہستیٔ موہوم کے لئے
غفلت میں مجھ سا بے سروساماں کیا رہے

دیوان جمیلہ: جلد دوم

اشاعت: 2004 صفحات: 431 غزلیں: 408

قطعات: 2 قصیدہ: 4

(1) حرف آغاز 2 صفحات
(2) عرض مرتب 3 صفحات
(3) جمیلہ خدا بخش ایک تعارف 2 صفحات
(4) خودنوشت سوانح حیات 3 صفحات

ابتدا: غزل

اپنا فردوس بریں یہ کوئے جاناں ہوگیا
کیا کروں جنت میں جاکر میرا ساماں ہوگیا
دفن ہوتی جارہی اس میں ہمیشہ آرزو
دامن دل تو مرا گورِ غریباں ہوگیا
اپنی لیلیٰ کے تصور میں ہوا گرم فغاں
شعلۂ آہِ رسا مجنوں سا عریاں ہوگیا

اختتام قصیدۂ نعتیہ

اے عشق یہ دل اپنا تو نازوں سے پلا ہے
ہمراہ اسے لے کے کدھر کو تو چلا ہے
تلوؤں میں چبھ جائے کہیں خارِ مغیلاں
تکلیف بہت ہوگی کہ چھالوں سے بھرا ہے
رو کر یہ کہا دل نے کہ روکو نہ مجھے ہرگز
اس عشق کے کوچہ میں تو سلطان گدا ہے

دیوان جمیلہ: جلد سوم

سن اشاعت: 2005 صفحات: 207

غزلیں: 370، زقصیدہ-2، مناجات-1

(۱) حرف آغاز 2 صفحات
(۲) عرض مرتب 4 صفحات
(۳) جمیلہ خدا بخش ایک تعارف 6 صفحات
(۴) خودنوشت سوانح حیات 3 صفحات

ابتدا: مناجات

چھوڑ کر در کو ترے جائے کہاں اور کدھر
ہو عنایت کہ شہ دین جمیلہ پہ نظر
ہو کے بیتاب وہ کہیں پہ مرے سرور
تشنہ و افتادہ ام اے چشمہ حیواں مددے
خضر عالم مدد ے، سرور جیلانی مددے

دیوان جمیلہ: جلد پنجم

سن اشاعت: 2005 صفحات: 360

غزلیں: 348 قطعات: 14

(۱) حرف آغاز 2 صفحات
(۲) عرض مرتب 4 صفحات
(۳) جمیلہ خدا بخش: ایک تعارف 6 صفحات
(۴) خودنوشت 3 صفحات

دیوان جمیلہ: جلد ششم

سن اشاعت: 2006 صفحات: 312

غزلیں: 168 زقطعات: 36 رباعیاں: 35 مثنویاں: 2 قصیدہ: 1

(1) حرف آغاز 2 صفحات
(2) عرض مرتب 3 صفحات
(3) جمیلہ خدا بخش: ایک تعارف 6 صفحات

دیوان جمیلہ: جلد ہفتم

سن اشاعت: 2006 صفحات: 176

(1) حرف آغاز 2 صفحات
(2) عرض مرتب 2 صفحات
(3) جمیلہ خدا بخش: ایک تعارف 6 صفحات
(4) خودنوشت سوانح حیات 3 صفحات

دیوان دو حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: غزلیں 97 دوسرا حصہ: نعت، منقبت، قصیدے 73

دیوان جمیلہ کی جلد چہارم اور جلد پنجم خدا بخش لائبریری کے کیٹ لاگ میں موجود نہیں ہیں۔

جمیلہ کے والد احمد کبیر الدین نے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا۔ عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ اس عہد کے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی کی بھی تربیت دی تھی۔

جمیلہ کی موسیقی کے بارے میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''جمیلہ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی بلکہ خدا بخش صاحب نے اس کی تربیت کے لیے ایک اتالیق بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اس سلسلہ کی بھی ایک کتاب ''ستار و طبلہ'' ہے جو خدا بخش خاں لائبریری میں موجود ہے۔''

(تاریخ اردو ادب (جلد اول) ص:428)

جمیلہ نے اردو غزل کی مروجہ اصناف غزلیں، قطعات، رباعیات، نعت، منقبت، سلام، قصیدے، نظمیں اور مثنوی پر طبع آزمائی کی ہے۔ جمیلہ کے دیوان میں 2104 غزلیں (جلد چہارم اور جلد پنجم کی غزلیں چھوڑ کر) موجود ہیں۔ اردو شاعری کی روایت سے لے کر آج تک کسی بھی شاعرہ کی اتنی غزلیں موجود نہیں ہیں۔

جمیلہ اپنے پیرومرشد سید مرشد علی القادری سے عقیدت رکھتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تصوف اور معرفت کا رنگ غالب ہے۔

جمیلہ کی شاعری میں نسوانیت کا احساس ابھرتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ جمیلہ نے دل کے ذریعہ اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے دل کو لے کے مجھ سے یہ کہا صنم نے ہنس کر
تجھے دل تو ہم بھی دیتے اگر اعتبار ہوتا

میرے یوسف کے خریدار کا کیوں کر ہو شمار
مجمع سد رہ پہ فزوں مصر کے بازار سے تھا

ازل سے دل جو مرا عاشق جمال ہوا
تو بوستان ریاضت کا وہ نہال ہو ا

دل میں الفت کا چھپانا اور چپکے بیٹھنا
خون آنکھوں سے شب فرقت بہانا اور تھا

موسیٰ میں نہیں کہ غش کروں گا
دل میرا بنا ہے طور تیرا

اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جمیلہ کی شاعری ''دل'' کے اردگرد گھومتی ہے۔ ان کی بیشتر غزلوں میں دل ہی کے ذریعہ اپنی بات کہنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔

جمیلہ کے یہاں عشق کی دل سوزی، حرماں نصیبی، دل گداختگی، جگر برشتگی، کرب و کسک، آہ وزاری، بے قراری و اضطرابی، اندوہ الم، حسرت غم اور تمنا کی نامرادی وغیرہ کا بیان کچھ اس طرح ہوا ہے:

حسن اپنا بھول جائے دیکھ کر یوسف جسے
اے مصور مجھ کو اک تصویر ایسی چاہیۓ

دل میں الفت کا چھپانا اور چپکے بیٹھنا
خون آنکھوں سے شب فرقت بہانا اور تھا

بلبل سے یہ ہنس ہنس کے کہا گل نے چمن میں
تم جاؤ ہمیں ناز اٹھانا نہیں آتا

اب تجسس ہے مرے دل کو اسی دلبر کا
خواب میں رخ جو دکھا کر مجھے روپوش ہوا

مجھے بھی اک نظر اپنا رخ زیبا وہ دکھلا دے
زمانہ حیرتی ہے یا خدا جس آئینہ رو کا

خدا ہی جانے کہ بن جائے جان پر کیسی
جمیلہ صبر وتحمل نے اب جواب دیا

:شاعرانہ تعلیٰ:

آساں نہیں تصوف ہر شخص جس کو جانے
میری غزل وہ سمجھے جو کوئی نکتہ داں ہو

ادنیٰ سی عنایت سے مرشد کی جمیلہ میں
ہوں میر کا اب ثانی استاد جوفن کا تھا

Dr. Md. Shahid
7/A, Jodhan Singh Road, P.O. Rishra
Distt. Hooghly-712248 (W.B)
9831365009/7980672722

# ترنم ریاض بحیثیت شاعرہ

مسعود احمد

ترنم ریاض کا تعلق وادی کشمیر سے ہے۔ کشمیر کی دھرتی ہر اعتبار سے زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ اس زرخیزی نے جن باکمال ادیبوں کو احترام بخشا ان میں ترنم ریاض کا نام نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ وہ حساس افسانہ نگار، کامیاب ناول نگار اور بہترین شاعرہ ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب میں بہت سارے نئے رجحانات نے سر اٹھایا۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات کے علاوہ تانیثیت وغیرہ تصورات بطور خاص ادیبوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ دوسری تحریکات و رجحانات کی طرح ہمارے ہاں تانیثیت کا تصور بھی مغرب سے ماخوذ ہے۔ وہاں تانیثیت کا بنیادی مقصد مرد اساس سماج کی بنیادیں مسمار کر کے انسان اساس سماج کی تشکیل دینا قرار پایا۔ مشرقی تہذیب نے اس تصور کو کچھ تحفظات کے ساتھ قبول کیا۔ بالخصوص ترنم ریاض کے ہاں یہ تصور ایک نئے سیاق میں پیش ہوا ہے۔ انھوں نے عورت کی جبلی اور فطری خصوصیات کو تانیثیت کی روشنی میں دیکھا اور پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی شاعری بالخصوص نظمیں خاص مقام رکھتی ہیں۔ اپنے شعری مجموعے ”زیرِ سبزہ محو خواب“ کے دیباچے میں انھوں نے کائنات کی اصل محافظ اور معمار عورت کو قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت مرد کے مقابلے میں نرم دل، جذبہ محبت سے سرشار اور تعمیری سوچ کی حامل ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ کائنات کے نظام کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی میں مصروف رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں قومیت، علاقائیت، مذہب اور رنگ و نسل کی آڑ میں درست ثابت کرنے کی خاطر اپنی تمام تر ذہنی و عقلی قوتوں کو جھونک دیتا ہے۔ موصوفہ کے مطابق:

> ”گویا قدرت نے حیات کے تحفظ کا کام عورت کو سونپ دیا اور انا پرست مرد نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہتھیار بنا کر جب چاہے، زندگی ختم کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اس نے بستیوں کو اجاڑنا اپنا

پیدائشی حق سمجھ لیا۔اور اس شوق کی تسکین کے لیے نت نئے ہتھیار تخلیق کرنا اپنے اولین فرائض میں شمار کرلیا۔"

(ترنم ریاض، زیرِ سبزہ محوِ خواب، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سن اشاعت، 2015، دیباچہ)

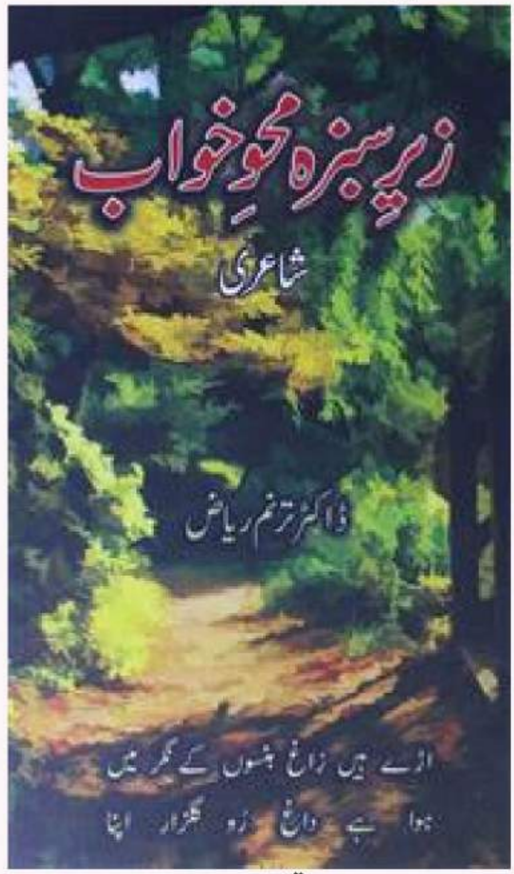


اس اقتباس سے مرد کے تعلق سے موصوفہ کے سخت رویے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔عالمی تاریخ کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے پر مشترک نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مذاہب سے لے کر تمام شعبہ ہائے حیات مرد کی دسترس میں رہے ہیں۔اس نے مذکورہ شعبوں میں اپنی ساکھ بٹھائے رکھنے کی خاطر مکروہ سے مکروہ ہتھکنڈے اپنانے سے گریز نہیں کیا ہے۔تاریخ میں ہٹلر اور مسولینی کی مثال تو ملتی ہے لیکن اس پائے کی ظالم اور بے رحم عورت ڈھونڈے پر بھی نہ ملتی۔تو ترنم ریاض کا مذکورہ بالا شکوہ صدفی صد نہ سہی اپنے غالب حصے میں درست معلوم ہوتا ہے۔موصوفہ اپنی نظموں ''عورت'' اور ''مرد'' میں ان دونوں جنسوں کی تعریف اس طرح کرتی ہیں:

**نظم عورت:**۔مہر محبت ،انس اور شفقت / ممتا، اپنائیت وصداقت / رنگ اور خوشبو / انگ معطر / دل کش، دل بر، مسرور، نازک / حسن طبیعت، وجہ مسرت / ویرانے کو کردے جنت / یہ سب دے کر / اس گل تن کو / خار بدن / خود عاشق طینت کی سنگت کے لیے بنایا؟ / پھولوں، کلیوں کو پتھر سے کیسی نسبت / کانٹے ہر پتی کو زخم لگا سکتے ہیں

**نظم مرد:**۔اس نے مطلب کی خاطر کیا استعمال / بیچتا بھی رہا اور خریدا کیا / شیشہ دل کو توڑا بدن کے لیے / پھر بدن کو بھی چھوڑا کسی دوسرے تن کی خاطر / کہ اس کی تلاش اب بھی جاری ہے / اور / جانے کب تک یہ جاری رہے گی ابھی / خونیں ہونٹوں کی وہ دائمی تشنگی / کس کی شفاف گردن کی نیلی نسوں سے / بجھے گی کبھی یا بجھے گی نہیں

(ترنم ریاض، پرانی کتابوں کی خوشبو، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سن اشاعت، 2006، ص 54/55)

ان دونوں نظموں کو ایک ساتھ رقم کرنے کا مقصد ترنم ریاض کی تانیثی تخلیقی اپج کا جنس کے تعلق سے تقابل کرنا ہے۔موصوفہ عام تانیثی تخلیق کاروں کی طرح مرد کو ہدف تنقید نہیں بناتی ہیں۔یا یوں کہہ لیا جائے کہ وہ مرد سے نفرت نہیں کرتی ہیں۔بلکہ ان کی تخلیقات میں ایک طرح سے مرد کی اصلاح کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے۔وہ عورت اور مرد کے مقام و منصب کی برابری کی بات ضرور کرتی ہیں لیکن اس میں جنسی اختصاص برقرار رہتا ہے۔وہ عورت کو اس کی ذات کا اصل مفہوم سمجھاتی ہیں۔ان کے نزدیک عورت کے بنیادی وفطری اوصاف اسے تانیثیت کی بہترین علمبردار بنانے کے لیے کافی ہیں۔مشرقی عورت کو تانیثیت جیسے تصور کو پڑھتے اور عمل کراتے وقت مغربی تصور سے حد درجہ ہوشیار رہنا چاہیے وگر نہ وہ اصل مقصد سے بھٹک کر جنسی استحصال کی خلط مبحث میں پھنس کر رہ جائے گی۔لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے مشرقی مرد اساس سماج یا پدرانہ معاشرے کے سامنے ہاتھ کھڑے کردیے ہیں۔وہ عورت کو اس کا آزاد اور مضبوط ہونے کا احساس بار بار دلاتی ہیں۔اسے مجبور و مقہور بن کر زندگی گزارنے سے بیدار کرتی ہیں۔اس کی عظمت کے گن گاتی ہیں اور دنیا کے تمام کام خود کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔مثلاً ان کی ایک غزل کے یہ شعر:

بہت اب بھی ہے باقی سنگھرش اس کا
ہیں تازہ ہوائیں ہی سنکلپ اس کا
جو ابرو اٹھے تو سمجھنا درانتی
جو ٹوٹے گا کنگن ،بنے گی کناری

یا

جو مجھ کو آنکھ دکھائے گا، تہذیب پہ داغ لگائے گا
پتھر کے دور کا انساں بھی پانی پانی ہو جائے گا

یا

یاتم مجھ سے وفا کرو یا میں ہرجائی بن جاؤں

مجھ سے ہو جاؤ ورنہ پھر تم جیسی ہو جاؤں گی

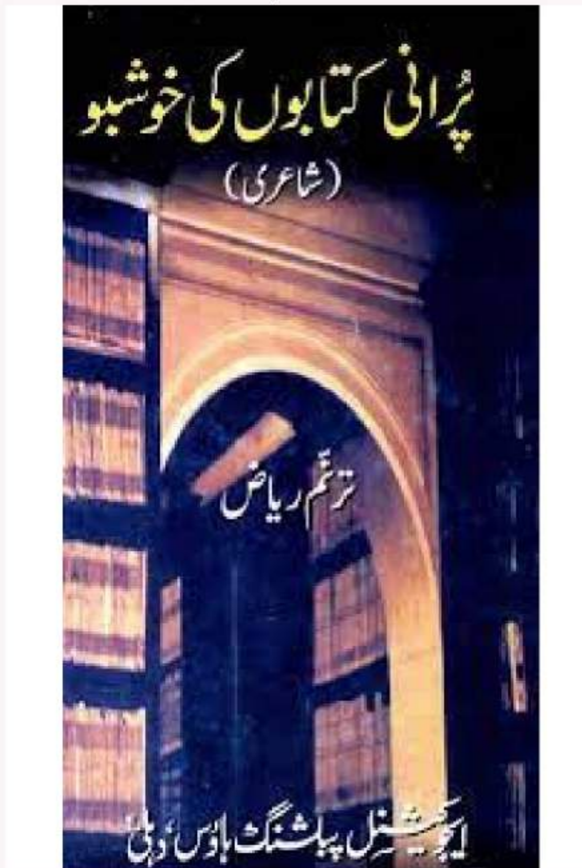


ان اشعار میں ترنم ریاض اپنے روایتی طرز گفتگو سے مکمل جدا نظر آتی ہیں۔ وہ مرد کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر رہی ہیں۔ عورت کی جن اشیا کو مرد اپنی روح کی تسکین کا سامان سمجھتا رہا ہے، ترنم ریاض نے انھیں اس کا ہتھیار بتایا ہے۔ عورت کی ابروؤں کو درانتی سے تشبیہ اور کنگن کو کناری سے جوڑ کر دیکھنا اپنے آپ میں ایک بڑا اعلان ہے۔ آج کی عورت پرانے وقتوں کی طرح اپنی ان خصوصیات کو اپنی کمزوری نہیں بننے دے رہی۔ وہ بہت فعال ہوگئی ہے۔ اس نے یہ بات اعلانیہ کہہ دی کہ مجھ سے جس نے بھی آنکھ دکھانے کی حماقت کی تو اس کا خمیازہ بھی بھگتنے کے لیے تیار رہے۔ مرد کے ہرجائی پن کو صاف لفظوں میں بیان کر کے اسے باز آنے کی تلقین کی۔ ترنم ریاض مغربی تانیثی تصور سے تھوڑا الگ ہٹ کر سوچتی ہیں۔ نتیجتاً دونوں طبقوں میں رسہ کشی پیدا ہوئی۔ ترنم ریاض مرد سے شکایت ضرور کرتی ہیں۔ ان کی شکایت میں نفرت نہیں ہوتی۔ یہ شکایت محبت بھری اور جذبہ اصلاح سے مملو ہوتی ہے۔ وہ خاندان اور سماج کو خوشحال دیکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ مثلاً اپنی ایک نظم ''کاروبار'' میں انھوں نے اپنے موقف کو بیان کرتے ہوئے ایک طرح کا سمجھوتہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میرا مرد گھر آتا ہے تو میں اپنی ویرانی پر ایک جھوٹی مسکان کا پردہ اوڑھ لیتی ہوں۔ میرا دل دہشت سے دھڑکنے لگتا ہے کہ کہیں اس کی گرج پھر سے گھر کا سکون نہ چھین لے۔ موصوفہ کے نزدیک عورت مرد سے صرف محبت اور عزت کی طلب گار ہوتی ہے۔ جب مرد اس کا ہاتھ تھامتا ہے تو عورت کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی۔ یہی ایک وجہ ہے کہ مرد کی موجودگی سے عورت کو اپنا گھر گلزار لگتا ہے اور جب وہ باہر چلا جاتا ہے تو یہ رونق آناً فاناً ویرانی میں بدل جاتی ہے۔

اس بات سے کسے انکار ہے کہ ہمارے سماج نے عورت کو ہمیشہ سے کمزور، کم عقل اور کم ظرف تصور کیا ہے۔ کسی بھی فیصلے میں ان کی شمولیت نہ کے برابر رہتی ہے۔ انھیں اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان سے کسی بھی معاملے کے متعلق کوئی رائے لی جائے۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی ، مذہبی ،معاشرتی گویا ہر اعتبار سے عورت کو اس کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اسے صرف گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا گیا۔ گھر کے تمام بنیادی کاموں کو اس کے لیے فرض قرار دیا گیا۔ مردوں نے اپنے طور پر عورت کی ذمہ داریاں طے کر رکھی ہیں۔ تمام بڑے اداروں کی ذمہ داریاں مردوں نے خود سنبھالیں ہے۔ ایسی صورتحال میں عورت کی شکایت وشکوہ بجا ہے۔ بلکہ یہ وقت ہے کہ عورت کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ اسے دوسرے درجے کا طبقہ نہ سمجھ کر انسان تسلیم کیا جائے۔ انسانوں کی طرح ہی اسے جینے کا موقع میسر ہونا چاہیے۔ کسی کے رحم وکرم اور بیجا احسان سے اسے برطرف کیا جائے۔ اس رویے سے سماج میں خوشحالی کا آنا یقینی ہے۔ خوشحالی کسی بھی سماج، قوم یا ملک کی پائیدار ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ترنم ریاض عورت کے ایک خاص وصف کو تانیثیت کا بنیادی جز قرار دیتی ہیں۔ وہ ہے اس کی رحم دلی۔ اسی رحم دلی کی بدولت عورت مرد کے برے سے برے فعل کو معاف کر کے اسے پھر سے اپنے اصل وجود کے ساتھ قبول کر لیتی ہے۔ مثلاً موصوفہ کی نظم ''ایک ہی جذبہ'' ملاحظہ ہو:

تم کبھی درد اس کا بانٹو گی

یا کبھی غلطی پہ ڈانٹو گی

چاہ میں، اپنا لوٹا دو گی وجود

ساتھ اک دوست کی طرح دو گی

حد سے گر وہ گزر جائے گا

توڑ ڈالے گا اعتماد کا گھر

چور کردے گا تمہاری وہ انا
بانٹ دے گا کئی ٹکڑوں میں تمہارے دل کو
کر کے برباد سکوں اپنا تم
راہ دیکھوگی اسی کی پھر بھی
لوٹ آئے گا تو پھر معاف بھی کر ہی دوگی
اسے ماں کی طرح اپنالوگی، خوش ہوگی
خود کو معشوق سمجھنے کی خطا مت کرنا
کہ تم اک عورت ہو
جس کے ہر روپ میں ممتا ہی بس رہتی ہے

(ایضاً ص،53)

اس نظم میں موصوفہ نے عورت کی اصل نفسیات کو بیان کیا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک حساس اور محتاط عورت تھیں۔ زندگی کے ہر رنگ کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنا چکی تھیں۔ اس لیے ان کے لیے عورت اپنی بنیادی تعریف میں صرف عورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ترنم ریاض عورت کے دنیاوی امور میں ترقی یا علوم دنیاوی کی حصولیابی کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کو ان تمام میدانوں میں پوری طاقت کے ساتھ اترنے کا مشورہ اور حوصلہ دیتی ہیں۔ وہ مرد کو باور کراتی ہیں کہ آج کی عورت کسی بھی میدان میں مرد سے پیچھے نہیں ہے۔ بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور لامحدود کاوشوں کی بدولت اس نے دنیا کے تقریباً ہر میدان میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آج کی عورت نے سائنس ،ٹکنالوجی ،طب، ریاضی، خلا، ادب گویا زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔ عورت آج تقریباً خود کفیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک جنسی برابری یا باہمی عزت واحترام کی یہ روشنی بڑے شہروں یا پڑھے لکھے طبقے تک پہنچی ہے۔ دور دراز کے علاقوں اور دیہاتوں میں آج بھی عورتیں غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان کے وجود کو آج بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ سماج یا معاشرے کے متعلق لیے جانے والے تمام فیصلے آدھی آبادی کو نظر انداز کر کے ہوتے ہیں۔ عورتیں جب تک Decision Making Bodies کا حصہ نہیں بنیں گی اس وقت تک ان کے حقوق کا استحصال ہوتا رہے گا۔ ترنم ریاض نے اپنی نظموں میں سب سے زیادہ زور عورت کے وجود کی بازیابی اور شناخت کی بازیافت پر دیا ہے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے نسائی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں میں بھی وہ عورت کے تشخص کی بحالی اور سماج میں اس کے مقام ومرتبہ کے تعین کی خاطر دردمندانہ اپیل کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں پر صرف ایک گیت درج کیا جاتا ہے۔

روک دو اپنے بڑھتے قدم بس وہیں
اتنی لاچار کمزور میں اب نہیں
صبر انسانیت ہیں مری طاقتیں
پیار قربانیاں ہیں مری دولتیں
گاڑی بانی کروں، کشتی رانی کروں
سرحدوں کی بھی میں نگہبانی کروں
سائنس، انصاف یا میں پڑھوں ڈاکٹری
کھینچوں ٹریکٹر، پولیس کی کروں نوکری
میں اڑاؤں جہاز اور خلا میں چلوں
پر قدم اپنی مٹی پہ ہی رکھتی ہوں
پھول چنتی ہوں، پتھر بھی ڈھوتی ہوں میں
چین کی نیند کانٹوں پہ سوتی ہوں میں
ہر محکمے میں گو کام کرتی ہوں میں
کالے دل، میلی آنکھوں سے ڈرتی ہوں میں
اب مگر میں بہت دن ڈروں گی نہیں
جرم روکے بنا میں مروں گی نہیں
کوئی کہہ دے یہ میلی نظر والے کو
چاہتے ہو زمانے میں عزت اگر
تو چنو اپنی خاطر وہ سیدھی ڈگر
جس پہ تم کو نہ ذلت اٹھانی پڑے
اور دعا دوسروں کی بھی شامل رہے

(ترنم ریاض، زیر سبزہ محو خواب، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سن اشاعت، 2015،ص24)

مختصر یہ کہ ترنم ریاض ادبی تانیثیت کی ایک معتبر آواز تھیں۔ گزشتہ سال کرونا جیسی عالمی وبا نے ان کو ہم سے جدا کر دیا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی یہ نظمیں اور دوسری تحریریں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

**Masood Ahmed**
Research Scholar
R/O Mohalla Khatana,Village Arai,
Tehsil Mandi,
Dist.Poonch-185102 (J&K,)
E.mail. masoodahmed203@gmail.com
Mob. 7042181225/9797303914

ڈاکٹر معصوم زہرا

# اختر الایمان کی شاعری میں یادوں کی بازیافت

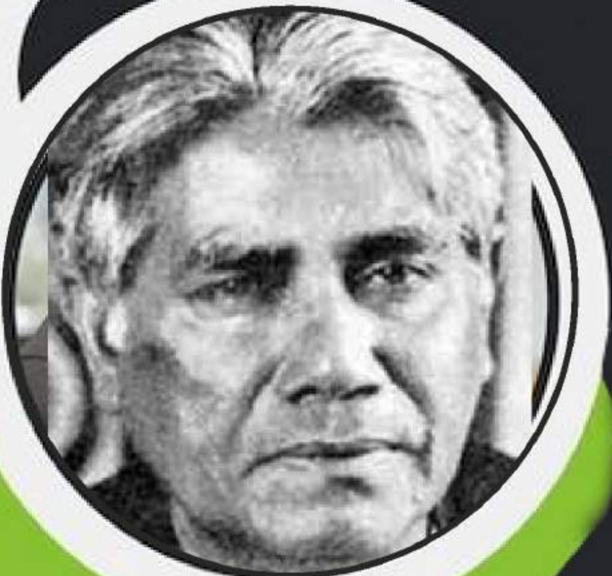

ہر ادب اپنے عہد کا ترجمان اور بدلتے ہوئے حالات و ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اصناف ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نظم نگاری میں تبدیلی کا یہ سلسلہ جدید اردو نظم کی صورت میں انجمن پنجاب کی تحریک سے شروع ہو کر اقبال تک پہنچا۔ اقبال کی خلاقانہ صلاحیتوں نے جدید اردو نظم کو تقویت و توانائی بخشی اور خیال و فکر کی نئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں نئے نظم نگاروں نے مغربی شاعری کے اصول و آداب کے تحت نظم نگاری میں نئے نئے تجربات کیے، لہٰذا نظم کی ہیئت، موضوع، فن اور تکنیک میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق نے الگ الگ نظریات قائم کیے جس کی بنیاد پر شعراء نے اپنے خیالات و تصورات کا اظہار کیا۔ ترقی پسند شعراء اجتماعیت کے قائل تھے تو حلقۂ ارباب ذوق انفرادیت کے، اول الذکر نے خارجیت کو ترجیح دی اور ثانی الذکر نے داخلیت کو۔ اس عہد میں نہ صرف موضوعاتی سطح پر نئے نئے تجربات ہو رہے تھے بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی نئے فنی و تکنیکی تجربے کیے جا رہے تھے۔

ایسی تخلیقی سرگرمیوں میں منفرد شناخت قائم رکھنا کسی بھی تخلیق کار کے لیے ایک چیلنج اور باعث ضمانت تھا اور اختر الایمان نے مجاز، فیض، علی سردار جعفری، جذبی، ساحر، جاں نثار اختر، جیسے ترقی پسند شعراء اور حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ میرا جی، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیا جالندھری وغیرہ جیسے شاعروں کے درمیان موضوعاتی، اسلوبیاتی ہر پہلو سے اپنی انفرادیت کی مثال قائم کی۔

اس عہد میں اختر الایمان واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شعری تخلیقات کے لیے منفرد راہ نکالی اور بدلتی ہوئی قدروں، سماجی، سیاسی و معاشی صورت حال، سرمایہ دارانہ نظام، وقت کی جبریت، زوال آمادہ تہذیب، وجود عدم کے مسائل جیسے متنوع موضوعات کو سرمایۂ سخن قرار دیا۔

اختر الایمان کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ مختلف یادوں پر مشتمل ہے جو کبھی مسجد کا علامیہ بن جاتی ہے، کبھی نظم ''تنہائی'' میں محبوب کا سر شاعر کے شانوں پہ ہونے کا احساس دلاتی ہے، کبھی نظم ''ایک لڑکا'' کے روپ میں متشکل ہو جاتی ہے جو آم کے

باغوں، کھیتوں کی مینڈوں، میلوں، ناٹک ٹولیوں، کبھی تتلیوں کے تعاقب میں گم رہتا ہے اور کبھی ہمزاد بن کر شاعر کو ''اختر الایمان تم ہی ہو'' کہہ کر اختر الایمان ہونے کا احساس دلاتا ہے اور یہی یادیں کبھی شاعر کو ''یادیں'' جیسی نظم لکھنے پر مجبور کرتی ہیں اور بار بار یہ مصرعہ کہنے پر اکساتی ہیں 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں' یادوں کی ان بازیافت کی وضاحت اختر الایمان نے بھی کی ہے۔

> ''جو کچھ میں نے لکھا وہ اس وقت نہیں لکھا جب ان تجربات محسوسات کی منزل سے گزر رہا تھا جو میری نظموں کا موضوع ہیں انھیں اس وقت قلم بند کیا جب وہ تجربات و محسوسات یادیں بن گئے تھے جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ ہر طوفان گزر کر سطح ہموار ہو گئی تھی اور ہر رفتہ و گزشتہ تجربے کی صدائے بازگشت مجھے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے میں ان سے وابستہ ہوں اور نہیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ میری بیشتر شاعری میں ایک یاد کا سا رنگ ہے اور یہ شاعری بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی''۔

(یادیں۔ پیش لفظ، اختر الایمان، پنجابی پستک بھنڈار دہلی، 1963 ص 7)

یادیں اختر الایمان کے مجموعہ ہائے کلام میں مختلف نظموں کے روپ میں روشن ہیں۔ بالخصوص مجموعۂ کلام ''یادیں'' کی نظموں میں یادوں کی بازیافت کا جو رنگ ملتا ہے وہ ان کے معاصرین میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ جب ''یادیں'' منظر عام پر آیا تو ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اسی امتیازی شان کی وجہ سے اس مجموعہ پر اختر الایمان کو 1960 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

'یادیں' کی وہ نظمیں جو فنی، تکنیکی اور موضوعاتی سطح پر قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ ان میں مسجد، ایک لڑکا، موت، یادیں تنہائی میں''، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ان نظموں میں 'مسجد' علامتی نظم ہے جو اس وقت وجود میں آئی جب قدیم تہذیبوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ عوام مذہب سے متنفر اور دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اختر الایمان اس دردانگیز منظر کو اپنی نم ناک آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور جب اس درد کا اظہار کرنا چاہا تو 'مسجد' جیسی نظم وجود میں آئی۔ یہ نظم مٹتی ہوئی تہذیب کا ایسا المیہ ہے جس کے لیے شاعر اپنے عہد میں تنہا نوحہ کناں نظر آتا ہے۔ نظم کا موضوع قدیم اور جدید قدروں کے مابین کشمکش، قدیم قدروں کی تنزلی اور جدید قدروں کی فتح ہے۔ نظم میں تین مرکزی کردار ہیں۔ مسجد، ندی، رعشہ زدہ ہاتھ۔ مسجد مذہب کی علامت ہے، ندی وقت کی علامت ہے، اور رعشہ زدہ ہاتھ انسانوں اور مذہب کے درمیان بڑھتے ہوئے خلا کو ظاہر کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ یہ نظم ایک ایسی مسجد کا خاکہ پیش کرتی ہے جو ویران اور شکستہ ہے، یہاں اختر الایمان کا مقصد مسجد کی ویرانی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس عہد کی مٹتی ہوئی تہذیب اور عوام کی مذہب سے دوری کا مظاہرہ کرنا ہے کیونکہ مذہب سے دوری اور قربت کا اندازہ عبادت گاہوں سے ہوا کرتا ہے اس لیے شاعر نے اس مسجد کو بطور علامت پیش کیا جو ویران اور شکستہ ہے، کلس ٹوٹا ہوا ہے، چراغ گرد آلود ہیں، فرش جاروب کشی سے محروم ہے اور ساتھ ہی مختلف پیکروں کے استعمال نے مسجد کی ویرانیت کو مزید واضح کر دیا ہے مثلاً ماضی و حال کا اپنے اعمال پر رونا، مسجد کے شکستہ کلس کا ندی کو تکتے رہنا، ٹوٹی ہوئی دیوار پر چنڈول کا گیت چھیڑنا، ابابیل کا شکستہ محراب میں بیٹھ کر سرد ممالک کی داستان کہنا اور دیئے کے رعشہ زدہ ہاتھ اس اضطرابی کیفیت کے مظہر ہیں جو مذہب کی تنزلی سے پیدا ہوئی ہے اور وقت کی جبریت سے پامال ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ندی کو وقت کی علامت بنا کر وقت کی ناگزیریت کو ڈرامائی پیرائے میں بیان کیا ہے:

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے

اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے
ایک میلا سا، اکیلا سا، افسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھاتے ہو کبھی
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے

نظم کے آخری بند میں شاعر زیادہ مضطرب ہے اس احساس ملال اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے اس میں ندی جو نئی قدروں کا استعارہ ہے جس کی موجوں میں اتنا تلاطم ہے کہ اپنی حد کو بھی پار کر کے مذہبیت کو فنا کر دینے کے قریب ہے، فانی فانی اور پانی پانی کی تکرار سے مسجد کی بربادی اور فنا ہونے کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔

مسجد کی طرح نظم ''موت'' میں بھی تین علامتی کردار ہیں مرد، عورت، دستک۔ آدمی جو بستر مرگ پر نزع کے عالم میں ہے پرانی قدروں کی علامت ہے جو مٹ رہی ہے۔ عورت اس کی محبوبہ یعنی جھوٹی تسلیاں ہیں اور دستک وہ آواز ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی اور ہمیشہ زندگی کے دروازے کو دستک دیتی رہتی ہے۔ اختر الایمان نے ان تین علامتی کرداروں کے ذریعہ زوال آمادہ قدیم اقدار کو ڈرامائی طرز میں منعکس کیا ہے۔ یہ نظم مکالمہ نگاری اور ڈرامائیت کی بہترین مثال ہے۔

''کون، آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم؟
''آہ احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ گئی
اور سرمایۂ انفاس پریشاں نہ رہا
میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد مری
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
''کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ نگاہوں کا چراغ''

نظم مسجد اور موت سے متعلق اختر الایمان لکھتے ہیں:

''میرا مقصد نہ کسی ویران مسجد کا خاکہ کھینچنا تھا اور نہ کسی دم توڑتے ہوئے آدمی کی کہانی لکھنا تھا یہ دونوں نظمیں علامتی ہیں جن کا رواج ہماری شاعری میں اٹھارہ سال پہلے بھی نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے''۔

(آب جو، پیش لفظ، اختر الایمان، سویرا آرٹ پریس لاہور، 1959، ص 7)

نظم ''ایک لڑکا'' طنزیہ ساخت کی کامیاب نظم ہے جو 62 مصرعوں اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ نظم کا مرکزی کردار ایک لڑکا ہے جو ضمیر انسانیت کا علامیہ بن کر نظم کو علامتی طرز کا ترجمان بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی حالات کے نشیب و فراز کی آندھیوں میں بھی چراغ زندگی جلائے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ نظم میں شدید روحانی کرب پوشیدہ ہے اور ساتھ ہی اس معاشرہ پر بھی طنز ہے جس میں رہ کر وہ لڑکا مختلف پریشانیوں سے دوچار ہوتا رہا اور حالات سے سمجھوتا کرتا رہا لیکن شاعر کی زندگی کے ہر موڑ پر وہ لڑکا سامنے آ جاتا ہے اور ''اختر الایمان تم ہی ہو؟'' کہہ کر اختر الایمان کو اختر الایمان ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ مثلاً

تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

نظم کے پہلے حصے میں قصباتی زندگی اور لڑکے کے بچپن کو مختلف مراحل میں دکھایا ہے۔ شاعر قصباتی زندگی کے ہر نقشے میں اس لڑکے کو متحرک پاتا ہے اور آم کے باغ، کھیت کی مینڈ، جھیلوں میں، بستی کی گلیوں میں، نیم عریاں کمسنوں کے ساتھ، میلے میں، ناٹک ٹولیوں میں، تتلیوں کے تعاقب میں، پرندوں کی خواب گاہوں میں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں وغیرہ ہر منظر میں بے فکری اور آزاد زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتا ہوا بچے کی چنچلتا، حریت، اور بے فکری زندگی کو مختلف قالب میں تقسیم کر کے پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ لڑکے کا کردار ہر منظر میں دوڑتا اور تعاقب کرتا ہوا نظر آتا ہے اس لیے شاعر نے لڑکے کو تیز بہتے ہوئے پانی سے تشبیہ دی ہے، کیوں کہ پانی کی صفت روانی ہے اور یہ لڑکا بھی ہر مقام پر متحرک ہے اس میں شوخی بھی ہے اور شرارت بھی۔

نظم کے دوسرے حصہ میں شاعر خدا کی نعمتوں کا اعتراف کرتا ہے کہ ساری دنیا کی نعمتیں خدا نے ہمارے لیے خلق کی ہیں، زمیں کا فرش بچھایا، آسمان کا شامیانہ بنایا، چاند اور سورج کی قندیلیں روشن کیں، چٹانوں کو چیر کر دریا نکالے اور خاکِ اسفل سے ہم جیسے انسانوں کی تخلیق کی مگر اسی حصے کے آخری پانچ مصرعوں میں اچانک طنز کا عنصر غالب ہو جاتا ہے مثلاً۔

اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے

تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

نظم کے اختتامیہ مصرعوں میں دو کرداروں کے درمیان مکالمہ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ایک کردار ہے معصوم لڑکا (ضمیر) اور دوسرا واحد متکلم (اخترالایمان) لڑکے کے بار بار سوال پر متکلم غصہ اور طنزیہ لہجے میں اسے کیا جواب دیتا ہے ملاحظہ ہوں

وہ آشفتہ مزاج،اندوہ پرور،اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
یہ لڑکا مسکراتا ہے ،یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے،جھوٹ ہے،دیکھو میں زندہ ہوں!

لڑکا نظم کے مرکزی کردار کی حیثیت سے متحرک پیکر کے روپ میں نظم کے آخر تک سوالیہ نشان تو قائم رکھتا ہے لیکن نظم کے آخر میں اپنے سوال کا خود ہی جواب دے کر نظم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ ایسا فعال اور متحرک کردار تخلیق کر کے نظم کو بھی متحرک اور جاندار بنا دینا شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔

پوری نظم میں ربط و تسلسل ہے، ڈرامائیت، منظر کشی اور مکالمہ نگاری نے نظم کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے ۔اخترالایمان نے ایک لڑکے کے ذریعے گاؤں اور شہر کی زندگی کے درمیان تضادات کو بڑی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔انھوں نے یہ نظم لکھ کر لڑکے کے کردار کو ایسی حیات جاودانی عطا کی ہے کہ جب تک نظم اور اخترالایمان کا نام زندہ رہے گا تب تک یہ لڑکا زندہ و پائندہ رہے گا۔

اسی نوعیت کی ایک اور نظم ''یادیں'' بھی ہے۔جس طرح نظم 'ایک لڑکا' میں ایک سوالیہ مصرعہ کی تکرار بار بار ہوتی ہے اسی طرح ''یادیں'' میں بھی شاعر نے دنیا کو آباد خرابہ کہہ کر یہ مصرعہ دہرایا ہے 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں'۔ یہ مصرعہ دہرے مفہوم کا متقاضی ہے ایک طرف تو یہ معاشرے کے بے حس انسانوں پر طنز ہے اور دوسرے مفہوم میں شاعر اپنی پریشانیوں سے خندہ جبینی سے نبردآزما ہو کر اظہار فخر کرتا ہے۔

لڑکا دونوں نظموں میں معصومیت اور ضمیر کا استعارہ بن کر نظم کے مرکزی کردار کے روپ میں موجود ہے۔

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلا جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اس نظم کا بالک زندگی کے میلے کی سج دھج میں اپنے حواس کھو کر باپ کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے جو روایتی اقدار کا نمائندہ ہے جس سے جدا ہو کر بالک خود کو اجنبی دنیا اور اجنبی ماحول میں گھرا ہوا پاتا ہے اور اس میلے میں شرافت ،نجابت، محبت، وفا کا سودا ہوتے دیکھ کر بہت متحیر ہوتا ہے۔نظم کا بالغ کردار راہِ مفر تو تلاش کر لیتا ہے مگر وہ لڑکا اسی میلے میں حیران و پریشان بھٹکتا رہتا ہے۔

دونوں نظموں کے پس منظر میں ایک گاؤں اور پیش منظر میں ایک شہر ہے، شہر کی صنعتی تہذیب کے زیر اثر انسانی قدروں کے شکست ہونے پر غم کا اظہار کیا گیا ہے جہاں شہر کو بے اطمینانی، بے حسی، چالاکی اور فریب کا مسکن قرار دیا ہے وہیں گاؤں کو سکون ،خلوص، ایمان داری، محبت اور انسانیت کا قدرداں تسلیم کیا ہے۔

یادوں کی بازیافت اخترالایمان کی شاعری کا خاص وصف رہا ہے۔ انھوں نے یادوں پر مشتمل بہت سی کامیاب نظمیں لکھیں جن میں نظم ''تنہائی میں'' کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔جس کی ابتدا ہی یاد اور احساس تنہائی سے ہوتی ہے۔

مرے شانوں پہ ترا سر تھا نگاہیں غمناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے؟
گھر گیا ذہن غم زیست کے اندازوں میں
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا

فنی اور تکنیکی اعتبار سے یہ کامیاب ترین نظم ہے۔نظم میں ببول کا سوکھا پیڑ اور تالاب جہاں ڈرامائیت پیدا کرتے ہیں وہیں انسان کی بے برگ و بار زندگی اور اس سرمایہ کی علامت بن کر ابھرتے ہیں جس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح گندگی اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔

نظم رومان اور حقیقت کا امتزاج کہی جا سکتی ہے۔ جہاں رومانیت میں درد و کرب کا ایک جہان آباد ہے وہیں حقیقت بیانی نے نظم کے لب و

لہجے میں تلخی پیدا کر دی ہے جس میں شاعر کا داخلی کرب پوشیدہ ہے۔ نظم میں یادوں کی بازیافت بھی ہے اور عصری مسائل کی ترجمانی بھی، چاند کا بے نور شعاعوں کے سفینہ کے ساتھ ابھرنا، نمناک آنکھوں سے دیکھنا وغیرہ معنی خیز پیکروں کے استعمال اور مغرب کی فنا گاہ میں پھیلا ہوا خون، تالاب کے سوکھے ہوئے ببول، انگور کی بیل وغیرہ جیسے بلیغ اشاروں نے نظم کو فنی نقطۂ نظر سے دوبالا کر دیا ہے۔

دور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے

شاعر نے تالاب اور سوکھی ہوئی ببول جیسی علامتوں کے پس پردہ معاشرے کے تلخ حقائق، خارجی و داخلی اضطراب، محرومی و ناکامی جیسے مسائل کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ غمِ زندگی نے شاعر کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ جہاں وہ اپنی زندگی کو اس ببول کے درخت کے مشابہ قرار دیتا ہے جو سوکھ چکا ہے اور ہاتھ پھیلائے اسی طرح کھڑا ہے جیسے غربت میں مسافر بے سہارا اور تنہا ہو جائے۔ اختر الایمان نے سوکھے ہوئے ببول کے پاس تالاب دکھا کر ان اشخاص کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود کسی مفلوک الحال کی معاونت نہیں کرتے۔ شاعر سکون قلب اور زخم زندگی کو بھرنے کے لیے چند آنسوؤں اور نفس کو کافی قرار دیتا ہے لیکن پھر کہتا ہے کہ ایسی زندگی بے کار ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو اس لیے ارادہ کرتا ہے کہ.....

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلتا و دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

اس بند میں شاعر نے پتھر کے صنم پوجنے کی بات کہہ کر بے حس انسانوں پر گہرا طنز کیا ہے اور ان پر پتھر کے صنم کو فوقیت دی ہے جو محبت کی ناکامی کا مظہر ہے۔ پتھر سے اتنی امید تو ہے کہ اس سے سر ٹکرایا جا سکتا ہے، اور اگر قدموں میں جان بھی دے دیں تو اس کی بے نور نگاہوں کی شکایت تو نہیں ہوگی اور نہ وہ میری محبت کا مذاق بنا سکے گا مگر جب پتھر کے صنم پوجنے کی بات آتی ہے تو شاعر حیران ہو جاتا ہے اور اہرام کے فراعین سے پوچھنا چاہتا ہے کہ....

ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کس کو پوجوں!

یہاں خوابیدہ فراعین کے پاس جانا مذہبی تنزلی کا اشارہ ہے۔

آخری شعر میں شدید الفت اور بے سروسامانی کے عالم میں شاعر کہتا ہے کہ...

کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
مرے شانوں کو تھپکتا غمِ تنہائی میں

اس طرح اختر الایمان نے اس نظم میں استعاروں، پیکروں، اور علامتوں کے ذریعہ ٹوٹتے اور بکھرتے خوابوں اور ارمانوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

اختر الایمان نے اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کے لیے مختلف اسالیب استعمال کیے ہیں۔ ان کی نظموں میں زبان و بیان، لفظیات، اور لب و لہجے کے آہنگ کا جو نظام ملتا ہے وہ انھیں معاصرین شعرا میں ممتاز کر دیتا ہے۔ جہاں ہیئتی و موضوعاتی تجربے کی رنگا رنگی ملتی ہے وہیں ان کا جدید اسلوب عام فہم زبان و بیان اور الفاظ و تراکیب کی نادر و نایاب مثالیں بھی ملتی ہیں۔

بیانیہ و ڈرامائی اسلوب، علامتی و طنزیہ اسلوب اور پیکر تراشی کے بہترین نمونے اختر الایمان کی نظموں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نثری آہنگ کی نظمیں بھی ان کے جدید شعری اسالیب پر گہری گرفت کا پتہ دیتی ہیں۔ عہد وفا اس نوعیت کی غیر معمولی نظم ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر الایمان اپنے عہد کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے تمام شعری حدود اور پابندیوں سے قطع نظر نظم نگاروں کو نئی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ فن اور تکنیک کے نئے نئے در وا کیے اور فرسودہ موضوعات کو ترک کر کے انسانی زندگی اور اس کے متفرقات کو موضوع شاعری بنایا۔ اختر الایمان کی اسی انفرادیت نے معاصرین شعرا میں انھیں منفرد و ممتاز مقام عطا کیا۔

□□□

**Dr. Masoom Zahra**
4/163 Toti Boundry Choti Masjid
Jamalpur
Aligarh-202002 (U.P)
Mob:7906746765

جویریہ خاتون

# 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں عورت کا بیانیہ

ناول اپنے دور کے حقیقی عکس کو نمایاں کرتے ہیں اور معاشی کشمکش ،فرقہ واریت، رواج، تقسیم ہند ،انسانی جذبات کی تصویر کشی کرنے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔''ایسی بلندی ایسی پستی'' پڑھ کر حیدرآباد کی اعلیٰ معاشرے کی تصویر، جاگیردارانہ طبقہ کے لوگوں کی حقیقی زندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس طرح'' آگ'' میں کشمیری سوسائٹی کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اسی طرح ''ایسی بلندی ایسی پستی'' تقریباً 264 صفحات پر مشتمل حیدرآباد کے اعلیٰ معاشرے اور جاگیردارانہ طبقہ کے گرد گھومتی ہے اور زمانی اعتبار سے ناول کا کینوس 1857 سے 1948 تک بکھرا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کے افراد بہت بگڑے ہوئے ،نواب زادے اور رئیس زادے ہیں جن کی زندگیاں دولت کی فراوانی اور دکھاوے کرنے میں پر گزر رہی ہے یہ ان کے زوال کی سب بڑی وجہ ہے ۔قابل جنگ ،مشہور الملک ،سرتاج الملک ،شجاعت شمشیر سنگھ،کوثر نواز جنگ، آرائش جنگ ،مہدی حسن کار جنگ، ذی جاہ جنگ اس طبقے کے نمائندہ کردار ہیں ، یہ کردار اپنے آسمان کے مٹتے ہوئے ستارے ہیں۔ یہ خود تو کچھ بھی نہ رہے لیکن اپنی اپنی موروثی جائیدادوں پر قابض ہیں اور ان پر ہی فخر کرتے ہیں۔ایک دوسرے سے خود کو بہتر ثابت کرنے کی تگ ودو میں منہمک رہتے ہیں۔ان کی حویلیوں میں خواصیں رکھنے کا وطیرہ رہا ہے۔ ناول کی فضا کے متعلق اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''یہ ایک دوسرے سے رقابت بھی محسوس کرتے ہیں ۔ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ اور سازشیں بھی کرتے ہیں،اور ایک دوسرے پر تفوق اور برتری حاصل کرنے کی تگ ودو میں منہمک اور مستغرق رہتے ہیں،ان کے یہاں خواصیں رکھنے کا چلن اور وطیرہ ہے تاکہ جنس کا کاروبار ٹھنڈا نہ پڑنے پائے۔نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے سلسلے میں ان کا ندیدہ پن اور ان کے عقاب نگہی زندگی کے متقضیات اور معمولات میں سے ہیں ۔یہ سب اونچی اونچی محل سراؤں میں رہتے ،کاروں میں گھومتے پھرتے اور رقص وسرود اور ناؤ نوش کی محفلوں میں دل وجان اور تندہی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ۔قابل جنگ کا بال روم ان کا ایک شاندار کارنامہ متصور کیا جاتا ہے اور کبر سنی اور جسمانی انحطاط واضحلال ان کے راہ میں کسی طرح حائل نہیں ہوتے ۔وہ غالب کے اس شعر کی مجسم تصویر نظر آتے ہیں: گو ہاتھ میں جنبش نہیں ،آنکھوں میں تو دم ہے! رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے۔''

''(اردو کے پندرہ ناول ،اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ ،شمشاد مارکیٹ ،علی گڑھ ،اپریل 2003، ص 142)

قابل جنگ کے خاندان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ان کی بیٹی

خورشید زمانی بیگم ہیں۔ان کی تین نواسیاں ہیں مشہور النساء، سرتاج اور نور جہاں ( خورشید زمانی بیگم اور سنجر بیگ کی تین بیٹیاں ) نور جہاں کو اس ناول کی ہیروئن کہہ سکتے ہیں۔ قابل جنگ کے بیٹے خاقان اور اصغر جو انتہائی ناکارہ اور عیش پرست اور شعور حس امتیاز سے بیگانہ ہیں۔

قابل جنگ انگریزی تعلیم، تہذیب وتمدن کے دلدادہ تھے۔بقول مصنف ''تین مرتبہ امیر گھرانوں پر مغربی تمدن کی لہریں آچکی ہیں۔غدر کے بعد سرسید کے زمانے میں سب سے پہلے قابل جنگ اور مشہور الملک نے اس زمانے میں اپنی معاشرت بدلی۔یہ اس قسم کی مغربیت تھی جیسے ترکی اور مصر کی مغربیت آج یعنی انگریزی رہائش، انگریزی کپڑے رائیڈنگ ، کتے ،انگریزی کھانا شراب ،بٹلر ،کرسچین آیائیں غرض کہ صاحب لوگ بننے کی تحریک۔اس کے ساتھ قوم پرستی، خودداری ،وقار اور مغرب کے ادب وفنون ،سائنس وغیرہ کی رغبت اس طرح دوسری طرح کا ہمارے ناول کے اہم کرداروں پر کم اثر پڑا کیونکہ اس دوسرے دور کی داخلی مغربیت کے ساتھ ساتھ وہی انگریزی کپڑوں، بول، چال، کلب، ناچ، وہسکی، اور سوڈا کا ایک ریلا بھی آیا جو ہمارے کرداروں کو بہا کر لے گیا اور تیسری اور آخری مغربیت۔اسے مغربیت کہہ لیجیے یا مزدکیت یعنی اشتراکی آزاد خیالی ، یہ تحریک پھیلی تو صحیح مگر کشن پلی تک محض ایک ذہنی فیشن بن کر آئی۔

نور جہاں اور سلطان حسین کے داستان کی چھوٹی تصویریں اور ان سے جڑے دوسرے کی زندگیوں کے واقعات کو بھی دکھایا ہے۔ان دو افراد کی زندگی کے ارد گرد سماجی زندگی کو چلتے پھرتے دکھایا گیا ہے۔نور جہاں اپنے چاروں طرف لوگوں کو عیاسی کرتے ہوئے دیکھتی ہے، ناجائز طور پر عشق کرنا لوگوں کا وطیرہ بن گیا ہے۔انسان کا تصور حیات اس کے ارد گرد ہونے والے چیزوں سے تربیت پاتا ہے اور اس کے مشاہدے براہ راست اس کے عمل ،فکر اور احساس پر اثر کرتے ہیں۔انھیں چھوٹے چھوٹے اور غیر متعلق واقعات سے سماجی روایت جنم لیتی ہے ۔نور جہاں اور سلطان حسین اس معاشرے کا حصہ بنتے ہیں کیونکہ تمام افراد کی زندگیاں ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔

اس ناول میں عزیز احمد نور جہاں کے کردار کو اپنے ناول میں نفسیات سے استفادہ کر کے ان کی داخلی کیفیات کو اجاگر کیا ہے جس سے نفسیات کی کرشمہ سازیاں کردار کی داخلی گھٹن کا مواد بن جاتی ہے اور نفسیاتی کشمکش کی صورت گری نئی اور تروتازہ بن کر ذہن میں ابھرنے لگتی ہے۔اس کی مثال ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں کرداروں کے ذریعے نمایاں ہوتی ہے۔اس میں نور جہاں کا کردار اہم ہے۔

ابتدا میں ایک جاگیردار فیملی کی لڑکی کی طرح زندگی ہوتی ہے، جس میں نور جہاں بے حد معصوم اور صاف گو، سادہ نظر آتی ہے۔گھر کے ماحول میں آزاد خیالی قابض تھی، اور اس کے مزاج میں مشرقی تہذیب کا بھی اثر تھا۔اس لیے وہ بہت confuse اور گھر والوں کے فیصلے پر منحصر ہے ۔خود سپردگی اس کے مزاج میں شامل ہے ۔جب نور جہاں اور سلطان حسین نکاح کے خوبصورت رشتے میں بندھتے ہیں تو سلطان حسین ایک آزاد خیال رکھنے والا مرد اور نور جہاں ایک نارمل احساس رکھنے والی عورت کی طرح خود سپردگی کرنے کے جذبے کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی قبول کر لیتی ہے۔لیکن یہ بات سلطان حسین کے کردار میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے وہ بیک وقت دو ناؤ کا سوار مسافر ہے۔شادی کے بعد ہنی مون کے لیے مسوری کا سفر کرتی ہے مسوری میں اس کی مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔مسوری کی پارٹیوں اور ہوٹلوں کی سیر کے رد عمل میں اس کے مزاج میں بہتسی تبدیلیاں آجاتی ہیں اس کو لوگوں کا سامنا کرنا آجاتا ہے، لیکن مشرقی عورت کی پاکیزگی برقرار رہتی ہے۔سلطان آزاد خیال کے ساتھ شکی مزاج کا مرد ہے وہ نور جہاں پر شک اور طنز بھی کرتا ہے اور خود کملا پر پر عاشق بنا پھرتا ہے۔جس کو ناول نگار نے دھرے دھرے ناول کے کینوس پر اتارا ہے۔نور جہاں اور سلطان حسین کی ازدواجی زندگی میں تلخی کی پہلی وجہ کملا پریش ہوتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ تلخی بڑھتی جاتی ہے۔وہ بہت ہی صدمے کا شکار ہوتا ہے۔وہ ایک خواب جو شادی کو لے کر ہر لڑکی کے ذہن میں ہوتی ہے وہ حقیقت میں آتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتا ہے جو دن اس کے لیے خوشی کے ہونے چاہیے تھے وہ اس کے لیے نہایت تلخ اور صبر آزما بن جاتے ہیں۔اقتباس:

''وہ اسی طرح بیٹھی رہی، جیسے اس کے دل میں کسی نے بھر پور خنجر اتار دیا ہو، اور رفتہ رفتہ جلن، رشک اور غصے سے زیادہ صاف اور واضح ایک اور احساس ابھرنے لگا....وہ احساس جس نے اس کی زندگی بدل دی ،محض اس کا احساس کہ یہ ناانصافی ہے۔''

(عزیز احمد،ایسی بلندی ایسی پستی،مکتبہ جدید لاہور 1948،ص 91)

سلطان حسین اپنی بہن زبیدہ کے کہنے پر شادی کے لیے راضی ہو جاتا ہے ۔سلطان حسین کی بوڑھی ماں اور اس کی بہن احساس کرواتی ہے کہ تمھاری عمر ڈھل رہی ہے۔سلطان حسین کو اپنی کانپٹی کے سفید بال دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ میری عہد شباب کی توانائی اور برانگیختگی رفتہ رفتہ جدا ہونے لگی ہے ۔اس کو لگتا ہے اب زندگی میں ٹھراؤ کی ضرورت ہے ۔نور جہاں کو

سلطان حسین کے لیے اس کی ماں اور بہن زبیدہ نے منتخب کیا ہے، جو پرکشش خوبصورت، مہذب، نارمل احساس رکھنے والی عورت ہے۔ایک روایتی عورت کی طرح خودسپردگی کے جذبے سے بھرپور عورت ہے اور یہی توقع وہ جائزطور پر اپنے شوہر سے بھی رکھتی ہے۔لیکن جب وہ مسوری جاتی ہے تو نور جہاں کو وہاں بہت کچھ مختلف دیکھنے کو ملتا ہے۔سلطان حسین کے ماضی کے بہت سارے رشتے ہیں۔

مسوری میں سیر وتفریح کے دوران نور جہاں کی دوستی بیگم کاظم مشہدی سے ہو جاتی ہے۔بیگم کاظم مشہدی سر علی مشہدی کی بہواور مسٹر حسن مشہدی کی بیٹی ہیں۔ان کی شادی ان کے چچازاد بھائی کاظم مشہدی سے ہوئی ہے جو پیشہ کے اعتبار سے جج ہیں۔ان کی دولڑکیاں ہیں فاطمہ اور جلیس۔کاظم مشہدی مع اپنی دونوں لڑکیوں کے تفریح کی غرض سے ہر سال مسوری آجاتی ہیں۔ان کے ہی ذریعے نور جہاں کو اپنے شوہر سلطان حسین کے بارے علم ہوتا ہے کہ ہنی مون کے زمانے میں مسوری کی پہلی شام اس کا شوہر کسی کملا پریس کے ساتھ تھا۔وہ سوچتی ہے کہ مجھ پر اتنے پہرے اور پابندیاں ہیں اور خود کملا پریس کے ساتھ رفاقت کی مثال قائم کی جا رہی ہے۔یہاں عورت کے فطری جذبات کو بڑے ہنرمندی کے ساتھ آشکار کیا گیا ہے۔

ناول کا اقتباس:

''اگر اسے کھڑکی سے باہر کسی کو گھورنے کا حق نہیں تو اس کے شوہر کو بھی عین ہنی مون کے زمانے میں، مسوری کی پہلی شام کو کسی اورلڑکی کو ساتھ باہر لے جانے کا بھی حق نہیں۔یا دونوں ایک دوسرے کی ملکیت میں یا کوئی کسی کی ملکیت نہیں اور ایک نئے طرح کے عزم کو اس نے اپنے دل میں جنم لیتا محسوس کیا اور اپنے ہونٹ بھینچے، اپنی خودداری کا ہر ہر جزو اپنی شخصیت میں سنبھالے اپنے شوہر کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔''

(عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، مکتبہ جدید لاہور، 1948، ص 88)

مسوری پہنچ کر سلطان حسین اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور وہ اکثر سیر وتفریح کے لیے جاتے وقت نور جہاں کو ساتھ لے جاتی ہے، نور جہاں کے سامنے دوسری عورتوں سے دیدہ دلیری کے ساتھ فلرٹ کرتا ہے۔دیر رات میں گھر واپس آتا۔ایک روز دیر رات تک نور جہاں اس کا انتظار کرتی ہے اسی وقت ایک نسوانی آواز ایک نئے راز کا انکشاف کرتی ہے اور اس کیفیت کا بیان عزیز احمد اس طرح کرتے ہیں۔اقتباس:

''وہ کھڑکی کے پاس آئی تو اس نے اپنے شوہر کو دیکھا۔صرف اسکی پشت، پشت کی ایک جھلک اور ساتھ وہ لڑکی جو تیسری پہر کو بیٹھی تاش کھیل رہی تھی۔وہ دونوں نیچے اتر رہے تھے۔۔۔۔چند منٹ کے بعد سکتے کے دنیا میں ہمیشہ آنے والے مسافر آئے۔شک جلن، آنسو، ایک نئی طرح کا تکلیف دہ احساس جس سے وہ اب تک واقف نہیں ہو پائی تھی۔دل کی مروڑ کا احساس، جلن، سیخ کبابوں کی سی جلن، دل جلنے بھننے کی مہک۔اور آنسو، دردسر کے ہر نشیب سے امنڈتے ہوئے سینکڑوں، ہزاروں آنسو، چہرے کا غازہ دھوتے ہوئے آنسو، آنکھوں کا کاجل بہاتے ہوئے آنسو۔اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ساکن اور جامد وہ کرسی پر بیٹھی رہی۔اب دیوار اندھرے میں کھو چکے تھے سیدھے ہاتھ ہاتھ کے پہاڑ پر کوٹھیوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ہوا کی ٹھنڈ ناگوار ہوگئی تھی۔خود سیوائے میں، بہت سے کمروں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔''

(عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، مکتبہ جدید لاہور، 1948، ص 88)

نور جہاں پاکیزگی کے ساتھ سلطان کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور جب شادی کے کچھ دنوں کے بعد اس کو اپنے شوہر کے بے وفائی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے وہ جذباتی طور پر شدید صدمے کا شکار ہو جاتی ہے۔سلطان حسین جو نور جہاں کا شوہر ہونے کے باوجود اپنے مزاج سے مجبور دوسری لڑکیوں، عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔لیکن نور جہاں اس کے علاوہ کسی اور دیکھے یا بات کرے یہ سلطان کو بالکل گوارا نہیں۔رفتہ رفتہ یہ زدوکوب کرنے پر اتر آتا ہے۔شادی کے پہلے اس کے سبز خوابوں کے بدلے اس کو تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جہاں اس کو کچھ بھی باقی نظر نہیں آتا ہے۔اقتباس:

''اس کے جانے کے بعد نور جہاں کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے اور ان آنسوؤں کے درمیان وہ مسکرائی پہلی مرتبہ اس نے اپنی ذات اور اپنے آپ سے باہر رنج، خوشی محبت اور تعلقات کی کش مکش کو محسوس کیا۔اس نے پہلی بار اندر سے محسوس کیا کہ اس کے باہر بھی دنیا میں انسان بستے ہیں، عورتیں بستی ہیں، جو بھٹکتی ہیں اور اس کا دل ہمدردی کے جذبے سے بھرپور ہوگیا۔''

(عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، مکتبہ جدید لاہور، 1948، ص 125)

نور جہاں اور سلطان حسین کے تعلقات وقت گزرنے کے ساتھ

خراب ہوتے گئے نور جہاں کو لگتا ہے کہ ولادت کے بعد سلطان حسین سدھر جائے۔سلطان حسین آرام سے پارٹیوں میں نور جہاں کے ساتھ شریک ہوتا ہے ایسے مواقع پر دوسری عورتوں سے بہت دلیری سے بات کرتا ہے۔نور جہاں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''نور جہاں کے مقابلے میں اس کی دونوں بہنیں خوش نصیب تھیں۔مشہور النساء کا شوہر ابوالہاشم انجینئر دختر رز پر بری طرح فریفتہ تو ضرور تھا،اور اس نے اپنے گھر کی بار میں انواع واقسام کی قیمتی اور کمیاب شرابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا،لیکن وہ سلطان حسین کی طرح نہ غیر عورتوں پر ریجھتا اور ان پر ڈورے ڈالتا تھا،اور نہ جنسی فتوحات کی تگ ودو میں اس درجے منہمک رہتا تھا۔''

('اردو کے پندرہ ناول، اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، اپریل 2003،ص 147)

عزیز احمد نے ترقی یافتہ تکنیک کے ساتھ ناول کے کردار کو پیش کیا ہے۔وہ اپنے کرداروں کے نفسیات سے مکمل طور سے واقف ہوتے ہیں اس لیے اپنے کرداروں کے ذاتی زندگی کے اتار چڑھاو کی عکاسی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کا انداز بیان،نفسیات کی تصویر کشی کرنے کا طریقہ ان کے نقطۂ نظر کو اجاگر کرتا ہے انھوں نے جس طرح کرداروں کے جذبات واحساسات کو پیش کیا ہے وہ بہت ہی فطری نظر آتا ہے۔ان کا ذہنی افق وسیع ہے،ان کا نظریہ زندگی کے حقائق سے بہت قریب ہے جس سے ان کے ترقی پسند نظریہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔جب وہ حقائق اور نفسیاتی الجھنوں کو سلجھاتے ہیں تو ایسے موقعوں پر ان کے زبان وبیان میں اور نفسیات کو بیان کرنے میں ان کا جوہر سامنے آجاتا ہے۔نور جہاں اور سلطان کے تعلق میں تضاد ہے جس کی وجہ سے ان کے رشتے میں بدمزگی پیدا ہوجاتی ہے۔رشتے کا یہ روکھا پن تشدد تک پہنچ جاتا ہے۔سلطان حسین کے تشدد کے بعد نور جہاں کا جو ردعمل ہے اس کا اظہار مصنف نے اس طرح کیا ہے۔اقتباس:

''نور جہاں کے اندر کوئی چیز آگ کی طرح سلگ کر بجھ گئی۔غصے کی بجائے رنج،ذلت اور بے بسی کا ایسا تلخ احساس،جو اس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔اس نے ذبیحہ کی ہوئی چڑیا کی طرح ایک مرتبہ سلطان حسین کی طرف ضرور دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ایک عجیب انکشاف تھا جس سے اس کی ہستی سمندروں کی نیچی تہ کی طرف بہہ گئی۔یہ کہ کوئی اسے مار سکتا تھا۔کوئی اسے ذلیل کر سکتا ہے۔ایک ایسا نیا تجربہ کہ جس کا ذکر سن کر اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے،اس نے سوچنا بند کر دیا۔چند منٹ کے بعد وہ بالکل خلا کے عالم میں تھی۔ہر چیز مفقود تھی۔ایسا خواب جو دیکھا جا چکا ہو۔جو اب محو ہو چکا ہو،صرف اس کی یاد باقی ہو۔اب صرف کسک پہ کسک تھی۔تھپڑ اس کے گال،اس کے بھیجے،اس کی کھال پر ضرب لگاتا ہوا،اس کی روح کو مفلوج کر چکا تھا۔اس کی روح سسکیوں میں منتقل ہو چکی تھی۔''

(عزیز احمد،ایسی بلندی ایسی پستی،مکتبہ جدید لاہور،1948،ص 164)

نور جہاں اور سلطان حسین کی ازدواجی زندگی کے مدوجزر کو جس انداز میں ناول کے کینوس پر اتارا ہے وہ آج کے معاشرے کی بھی حقیقت ہے۔نور جہاں جیسی بہت ساری عورتیں ہیں جو تعلیم یافتہ بھی ہیں ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں جن کے سہارے سماج کا دھارا بہہ رہا ہے وقت کا پہیا چلتا جا رہا ہے۔مصنف کی نور جہاں کی نفسیات سے گہری واقفیت ان کے مشاہدے کی مثال ہے۔عزیز احمد نے کردار نگاری پر پورا فوکس رکھا ہے جس سے ناول میں دلچسپی اور نور جہاں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔اس لیے نور جہاں کا کردار بہت مکمل اور دلکش لگنے لگتا ہے۔اس کی تعلیم مغربی اور تربیت مشرقی کی گئی ہے۔وہ دونوں ماحول سے واقف ہے اس کا اثر اس کے شخصیت میں نظر آتا ہے۔

انہی کرداروں کے ذریعے ایک پورے معاشرے،اس کے ہیئت اجتماعیہ کے پیچ وخم پوری طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں۔مصنف کرداروں کے رویہ اور ان کے باہمی گفتگو اور مکالموں کے ذریعہ طبقے کے تمام رخوں کو سامنے لاتے ہیں۔ناول میں ایک کردار رئیس سنجر بیگ کی بیوی خورشید زمانی بیگم کا بھی ہے۔ان کرداروں میں نور جہاں کا کردار ایک حقیقت پسند جدید عورت کی ترجمانی کرتا ہے۔

□□□

**Jweriya Khatoon**
Research Scholar
Dept Of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh -202002 (Up)
jweriyakhatoonalig786@gmail.com
Mob. No. 8791895435/ 7906593880

ڈاکٹر تسلیم عارف

# نور ظہیر کے افسانوں میں عصری مسائل

عالم انسانیت میں سر اُبھارتے مسئلے اور عوامی زندگی کے واقعات و سانحات کو ہر عہد میں تخلیق کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ تخلیق کار اپنے عصر اور اُس کے مسائل سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان یا عہد کا جینوئن ادیب، اپنے اِردگرد کے مسائل اور حالات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ نور ظہیر بھی ایک ایسی افسانہ نگار ہیں، جن کے افسانے توجہ طلب ہیں۔ نور ظہیر نے اپنے والد ،ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بانی سیّد سجاد ظہیر سے فکری استفادہ کیا ہے۔ نور ظہیر بھی ایک ماہر سیاست داں اور متحرک و فعال سماجی کارکن کی حیثیت سے اپنی نمایاں شناخت رکھتی ہیں۔ سماجی اور سیاسی مصروفیات کے بعد نور ظہیر کو جو وقت میسر آتا ہے، اُس میں وہ افسانے لکھتی ہیں لیکن رسائل و جرائد میں کثرت سے شائع ہونا غالباً انھیں پسند نہیں۔ اسے ہم اردو والوں کی بدنصیبی کہیں کہ ہم اُن کے نام اور اُن کے افسانوں سے کسی حد تک

غیر آشنا ہیں۔ ہماری اس غیر آشنائی کی وجہ، کہیں نہ کہیں وہ خود ہیں۔ حال ہی میں نور ظہیر کا افسانوی مجموعہ ’سیانی دیوانی‘ سرحد کے اُس پار سے شائع ہوا ہے جبکہ مجموعہ ’ریت پر خون‘ چند سال قبل دہلی سے اُردو اور ہندی میں شائع ہو چکا ہے۔ افسانوی مجموعے کے علاوہ اردو میں نور ظہیر کی سب سے اہم کتاب ’میرے حصّے کی روشنائی‘ ہے جو اُن کے والد سجاد ظہیر اور والدہ رضیہ سجاد ظہیر کی گھریلو روداد پر مبنی ہے۔ انگریزی اور ہندی میں نور ظہیر کی تقریباً دس کتابیں

شائع ہوچکی ہیں جو ڈیجیٹل مارکٹ آمیزن اور فلپ کارٹ پر دستیاب ہیں۔

نور ظہیر کو زمینی سطح پر عوامی مسائل کا گہرا ادراک ہے۔ مرکز کی فاشسٹ حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں اور اسکیموں کے خلاف وہ اکثر برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ سی.اے.اے کا مسئلہ ہو یا تین طلاق یا پھر عورتوں پر مظالم یا دلت اور پچھڑی ذاتی کے لوگوں پر زیادتی.... ہر محاذ پر محترمہ اپنی ایکٹیونس کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُن کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے کردار اور ماحول سے ہمیں اُنسیت ہونے لگتی ہے۔ اپنے افسانوں کی بنیاد اور موضوعات کے متعلق اُن کا کہنا ہے کہ:

"میرے ایکٹیویزم نے مجھے ہر طرح کے فرقے، طبقے، فکر اور سوچ سے رُوبرو ہونے کے موقعے فراہم کیے جس کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے وِرثے میں ملی ترقی پسندی اور مارکسی فلسفے کو بھی سوال کیئے بِنا، اپنانے سے انکار کیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ سچّی کہانیوں کا ایک انبار لگ گیا، جس کو میں جب جی چاہے، کھنگال کر، چھان، پرکھ کر اپنے افسانوں کی بنیاد بنا پائی۔"

(پیش لفظ، مجموعہ: سیانی دیوانی، از: نور ظہیر)

میں یہاں نور ظہیر کے افسانوی مجموعہ 'سیانی دیوانی' کے چند افسانوں سے ڈِسکورس قائم کر رہا ہوں، جن میں ہمعصر مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ 'چکّر گھنّی' ہے جو سکینہ نامی ایک خاتون کی دردناک کہانی ہے۔ سکینہ ہمارے معاشرے کی وہ بدنصیب عورت ہے، جسے اُس کے شوہر نے پانچ بار طلاق دی ہے۔ یہ افسانہ حلالہ جیسے سلگتے اور متنازعہ فیہ موضوع پر مبنی ہے۔ افسانے کی کردار ذکیہ تین طلاق سے متاثرہ خواتین کو انصاف دلانے کے لیے سماجی سطح پر کام کرنے والی ایک عورت ہے۔ اُس کی میٹنگ میں سکینہ پہنچتی ہے۔ سکینہ کا شوہر عبدالرشید شراب اور افیم کی لت کا شکار ہے۔ جب اُس پر نشہ چڑھتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور معمولی سی بات پر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ افسانے میں سکینہ اپنی پانچوں طلاق کا واقعہ ذکیہ کو سناتے ہوئے آب دیدہ ہو جاتی ہے۔ افسانے میں ایک کردار مولوی کا بھی ہے جس کی مذہبی کم علمی اور غلط رہنمائی کا شکار سکینہ کئی موقعوں پر ہوتی ہے۔ اس مظلوم عورت کی زندگی کے قیمتی سولہ سال نکاح، طلاق، عدّت اور حلالہ کے بیچ چکّر گھنّی بنے گزر جاتے ہیں۔ ذکیہ اُس کی روداد سننے کے بعد نہ صرف اُسے دلاسہ دیتی ہے بلکہ اُس جیسی خواتین کی اُجڑی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اُسے پُرعزم بھی کرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"ذکیہ نے سر کو ایک جھٹکا دیا— رونے سے بھلا کیا حاصل ہوگا؟ یہ وقت جدوجہد کا ہے اور سبھی مدعوں پر کھل کے بات کرنے کا ہے۔ اُس نے فائل کھول کر ایک کاغذ نکالا اور سکینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی: "اِسے پڑھ لو، سمجھ میں آئے تو دستخط کرنا۔ یہ اپیل ہے کہ ہمیں برابری کے سب حق چاہیئے، جو بھارت کا آئین ہمیں دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ لڑائی لمبی بھی ہے اور مشکل بھی لیکن اس مورچے پر اُترنا تو پڑے گا۔"

ذکیہ باہر کی طرف چل دی تھی، جب اُسے پھر سکینہ کی آواز میں، 'باجی' سنائی دیا۔ سکینہ پاس آگئی تھی، پرچے کو ہلاتے ہوئے وہ بولی: "اِس کی ہم فوٹو کاپی کروالیں؟ دوسری عورتوں سے بھی بات کریں گے اور دستخط جمع کریں گے۔ ارے سنو سب....." سکینہ تیزی سے چلتی ہوئی، کچھ عورتوں کے ساتھ بازار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ذکیہ کو بہت دھندھلی سی ایک راہ دکھائی دے رہی تھی۔ راہ کس منزل پر پہنچائے گی، اِس کا کچھ پتا نہ تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں، راستہ اگر خود ہی بنانا ہے، چلنا بھی اُس پر خود ہی ہے تو منزل بھی خود ڈھونڈ ہی لیں گے۔"

یہ بات روشن ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں 'تین طلاق' اور 'حلالہ' نے ہمیں کس قدر رسوا کیا ہے۔ علماء کی درست پیروی کے فقدان اور اِن اُمور پر کھل کر قرآن و حدیث کی روشنی میں عدمِ گفتگو کے باعث یہ مسئلہ روز بروز سر اُبھارتا جا رہا ہے۔ ہمارے مسلم معاشرے کا ایک طبقہ تو ایسا ہے جو 'حلالہ' کے مفہوم سے ہی ناواقف ہے۔ یہ کہانی قاری کو اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے کہ ہم کس عہد میں سانس لے رہے ہیں، جہاں شرابی اور نشہ خور اپنی بدکاریوں سے ایک لمحے میں عورت کی تقدیر پر سیاہی پوت دیتے ہیں۔

آپسی مُنافرت کے اس دورِ بد میں نور ظہیر کا افسانہ 'بالوچری' نعمت بھی ہے اور غنیمت بھی۔

اس افسانے کی قرأت سے جہاں ایک فن کار کا درد، اُس کے احساسات و جذبات اور اُس کے شاہکار کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں دوسری جانب ایک مسلم شخص کی، ہندو مذہب سے قلبی عقیدت کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ 'بالوچری' شمالی 24/ پرگنہ کے بشیر ہاٹ کے ایک غریب جولاہے اکرم علی کی کہانی ہے جو اپنے فن میں یکتا ہے۔ اُس کی بنائی ہوئی ساڑی بالخصوص 'بالوچری' کی شہرت مضافات سے لے کر کلکتے تک ہے۔ بالوچری ساڑی کی ایک انتہائی نفیس قسم ہے، جسے تیار کرنے میں خاصی محنت لگتی ہے۔ اس میں استعمال ہونے والے ریشم، سوت اور

دیگر اجزا کافی مہنگے ہوتے ہیں۔ اکرم علی ایک بالوچری کے مٹریل کی خریداری کے لیے اپنی بیوی کے زیورات تک بیچ دیتا ہے۔ ساڑی کی خبر کلکتے میں مقیم ایک عرب شیخ کو ملتی ہے اور وہ بشیر ہاٹ، اکرم علی کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اُسے ساڑی دکھانے کی گزارش کرتا ہے۔ ململ میں لپٹی ساڑی کی خوبصورتی اور رنگوں کے امتزاج سے شیخ کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور بے ساختہ اُس کے منہ سے 'سبحان اللہ' نکلتا ہے۔ عرب شیخ ساڑی کی قیمت چار لاکھ لگاتا ہے، جو مقررہ قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، قیمت کے علاوہ ایک موٹی رقم بخشش کے طور پر بھی آفر کرتا ہے۔ اکرم علی، شیخ سے استفسار کرتا ہے کہ عرب کی عورتیں تو ساڑی زیبِ تن نہیں کرتیں تو اسے خریدنے کی وجہ؟ شیخ کہتا ہے کہ:

اگلے مہینے میری شادی ہے.... ہم لوگوں میں لڑکی کے لیے لڑکے والوں کی طرف سے عبایہ بھیجا جاتا ہے۔ اس ساڑی کو کاٹ کر عبایہ بنے گا..... پلو سے نقاب اور اوپر والا حصّہ۔ بہت خوب صورت لگے گا اس کا عبایہ.....''

اکرم علی کو یہ ہرگز منظور نہیں کہ اس کے گاڑھے پسینے اور مہینوں کی محنت سے بنی ساڑی کو قینچی سے کاٹ دیا جائے۔ وہ شیخ کے آفر کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ:

''میں اپنی ساڑی آپ کو نہیں بیچوں گا....... یہ ساڑی میری روح ہے شیخ صاحب اور روح کو کاٹ پھاڑ کر، ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاتا، سوئیاں چبھو کر چھلنی نہیں کرتے روح کو محترم!''

اکرم علی کے بیٹے کو حیرت ہوتی ہے اور غصہ آتا ہے کہ آسمان چھوتی قیمت ملنے کے باوجود، اُس کا باپ ساڑی کی فروخت کے لیے تیار کیوں نہیں ہے..... باپ بیٹے کے درمیان ساڑی کی فروخت کو لے کر بحث ہوجاتی ہے۔ اسی مقام پر افسانہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور افسانہ نگار کی صلاحیت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''کیا کہہ رہے ہو ابا؟'' اکرم کا دوسرا بیٹا کریم الدین بولا۔ ''اتنا پیسہ تو ہم نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے!''

''لیکن بنائی تو بیچنے کے لیے ہے نا؟'' شیخ کے سکریٹری نے پوچھا۔

''آج تک جتنی ساڑیاں بنائی، سب بیچیں، یہ نہیں بیچوں گا۔ یہ ساڑی میں نے ماں درگا کے لیے بنائی ہے۔''

''یہ کون ہے؟'' شیخ نے شاید ماں درگا کو کوئی دوسرا، زیادہ مالدار گراہک سمجھا۔

''ابا، دیوی کو پہنائی گئی ساڑی بھی تو برباد ہی ہوتی ہے نا۔ مورتی کے ساتھ ہی وسرجن ہوجاتا ہے ساڑی کا۔''

زور کی تڑاک کی آواز آئی اور شمس الدین گرتے گرتے بچا— ''خبردار جو کافروں جیسی باتیں منہ سے نکالی۔ بیٹی کو سجا سنوار کر ہی تو سسرال بھیجا جاتا ہے۔ میری بنائی ہوئی ساڑی پہن کر، دس دن سے بچھڑے شیو کو درگا رجھاتی ہے، تبھی تو دھیان ٹوٹتا ہے مہادیو، طلسمی شیو کا! سب میری بنائی ہوئی ساڑی کی وجہ سے ہی تو ہے۔''

''اتنی ساڑیاں ایک ساتھ پہنتی ہے دیوی درگا؟'' شریف الدین نے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنی پہنتی ہے، کیسے پہنتی ہے، کیوں پہنتی ہے یہ تو دیوی ہی جانے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میری بنائی ساڑی بہت پسند کرتی ہے ماں...... اس لیے تو ہر سال بہتر سے بہتر ساڑی بن جاتی ہے، دیوی درگا ماں کے رحم و کرم سے۔''

ایک مسلم کردار کی زبان سے کہلوانا کہ 'اُس نے ساڑی ماں درگا کے لیے بنائی ہے!' یہ ظاہر کرتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے کمالِ فن سے افسانہ کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ افسانہ 'بالوچری' کا کردار اکرم علی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہترین ترجمان ہے۔ یہ صرف ایک افسانہ نہیں بلکہ ایک پیغام ہے کہ مسلمان صرف اپنے ہی مذہب کی عزت نہیں کرتا بلکہ وہ دیگر مذاہب اور اُس کے دیوی دیوتاؤں سے بھی عقیدت رکھتا ہے۔ اکرم علی اپنی ذات میں ایک سچا مسلمان، عمدہ تخلیق کار اور اعلیٰ انسان ہے اور دنیا کا ہر مذہب انسان اور انسانیت کا درس سب سے پہلے دیتا ہے۔

افسانہ 'دربدر' آپسی رقابت اور رنجش پر مبنی ایک ایسی فیملی کی کہانی ہے، جو شہر میں فساد برپا ہونے پر خوف سے اپنے گھر کو چھوڑ کر ایک کیمپ میں پناہ گزیں ہے۔ فیملی کے سربراہ صدیقی صاحب ہیں، جو ایک بڑے پبلک اسکول میں وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی اہلیہ، ایک بیٹی اور دو بیٹوں پر مشتمل اُن کا کنبہ ہے۔ اکرم نامی ایک ٹیمپو ڈرائیور نے صدیقی فیملی کو فساد کے وقت حفاظت سے نکال کر کیمپ میں جگہ دلوائی تھی۔ صدیقی اور اُن کے افرادِ خانہ کی طرزِ زندگی انتہائی ماڈرن ہے۔ ان کی بیٹی بتول کو موسیقی سے شغف ہے نیز باپ بیٹے صوم و صلوٰۃ کے پابند نہیں ہیں۔ ظاہر ہے دینی اور مذہبی فرائض کی عدم ادائیگی بندے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے لیکن اسے ہماری اَبلہی کہیے کہ ہم خدا اور بندے کے معاملات کے بیچ کود پڑتے ہیں اور فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ افسانے میں

بھی نظر آتا ہے۔نور ظہیر نے کیمپ میں موجود لوگوں اور مولویوں کی منفی ذہنیت کی کیا خوب عکاسی کی ہے:

''فوجیوں نے ایک کیمپ کمیٹی بنانے کی رائے دی جس پر اندرونی امن بنائے رکھنے کی ذمہ داری ہو۔اس کمیٹی کے لیے صدیقی صاحب کا بھی نام آیا لیکن وہاں موجود مولویوں نے اسے ایسے ردّ کر دیا، جیسے کسی نے بہت سنجیدہ بات چیت کے بیچ کوئی بھدّا مذاق کر دیا ہو۔افسروں نے کہا بھی کہ صدیقی صاحب تو پڑھے لکھے ہیں اور ایسے عہدے پر کام کرتے رہے ہیں، جہاں فیصلہ لینے کا انھیں تجربہ ہے۔جواب ملا کہ مسلمانوں میں اُن کا کوئی رُتبہ نہیں ہے۔اُن کے گھر کی عورتیں تو پردہ تک نہیں کرتیں، صدیقی صاحب اور اُن کے بیٹوں کو کبھی جمع کی نماز میں نہیں دیکھا گیا، پتا نہیں انھیں مسلمان کہنا بھی چاہیے یا نہیں؟''

افسانے میں ایک مقام پر صدیقی صاحب کے پڑوسی ایک ہندو گجراتی فیملی، اُن کی خیر و عافیت دریافت کرنے کیمپ پہنچتی ہے۔اُن کی آمد سے کیمپ میں موجود مولوی اور دیگر حضرات چراغ پا ہو جاتے ہیں اور متفقہ فیصلہ کرتے ہیں کہ صدیقی فیملی کو کیمپ سے دربدر کر دیا جائے۔ایک کنبہ جو پہلے ہی فساد کی زد میں آ کر اپنے علاقے اور گھر سے دربدر ہے، اُسے اپنے ہی مذہب کے لوگ محض اس لیے کیمپ سے نکالنے کا فرمان جاری کرتے ہیں کہ اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک ہندو فیملی اُس سے ملنے آتی ہے۔صدیقی صاحب کو جب دو گھنٹے کے اندر ٹینٹ خالی کرنے کا پروانہ ملتا ہے تو وہ فوراً اپنے محسن اکرم ٹیمپو والے کو طلب کرتے ہیں۔اکرم کا بدلا رویہ، اُس کی سطحی ذہنیت کا غماز ہے۔افسانے کی چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''یہ کیمپ ضرورت مندوں کے لیے ہے۔ایسے مسلمانوں کے لیے جن کا کہیں کوئی ٹھور ٹھکانا نہ ہو......آپ تو ان ہندوؤں کے یہاں بھی جا سکتے تھے۔کہاں آپ اونچے، پڑھے لکھے کلاس کے لوگ، کہاں یہ غریب مسلمانوں کا اسلامی کیمپ؟ آپ کی یہاں کیسے گذر ہوگی؟......اپنے ہندو دوستوں کو فون کر کے کہو، کار لے کر آئے اور سب کو لوا لے جائیں اور کرنے کی تو کیا پوچھتے ہو، بتول نے ماشاءاللہ ایسا گلا پایا ہے، صورت بھی اچھی ہے، کہیں بھی ناچ گا کر......''

بتول، صدیقی صاحب کی بیٹی ہے۔اپنی بہن کے متعلق اس طرح کے نازیبا جملے سن کر عالم برافروختہ ہو جاتا ہے اور اکرم کا گریبان پکڑ لیتا ہے۔آپسی ہاتھا پائی پر روک لگانے کے لیے کیمپ کے فوجیوں سے مدد کی اپیل کی جاتی ہے۔فوجی یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ: ''ہم کیمپ کی حفاظت کے لیے ہیں۔کیمپ کمیٹی کے فیصلے میں ہمارا دخل نہیں ہے۔'' فوجی صدیقی کو آفر کرتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو انھیں فوجی لاری میں شہر سے 8 رکلومیٹر دور کیمپ میں بھیجا جا سکتا ہے اور مجبوراً صدیقی صاحب کو ہاں کرنا پڑتا ہے۔

عصرِ حاضر میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم آپس میں متحد نہیں ہیں۔ہمارے درمیان اتحاد و اتفاق کا معاملہ نہیں آیا ہے۔افسانے کا اختتامیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہماری عدم یکجہتی پر دوسرے کس طرح پھبتی کستے ہیں؟ دیکھیے:

''سامان لیے پانچوں کیمپ کے پھاٹک پر بیٹھے فوجی لاری کا انتظار کر رہے تھے۔ڈیوٹی بدلی تو نئے سپاہیوں کو، پہلے والے نے پورا قصہ سنا ڈالا۔نئے سپاہیوں نے ایک ایک کو دھیان سے دیکھا، پھر ایک بولا: ''اِنھیں اُجاڑنے پر بے کار اتنا روکڑا خرچ ہو رہا ہے، بدنامی الگ ہو رہی ہے۔اِنھیں تو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، خود ہی لڑ مر کر ختم ہو جائیں گے۔''

مجموعہ 'سیانی دیوانی' میں اور بھی کہانیاں ہیں، جو افسانہ نگار کی زبردست تخلیقی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں۔نور ظہیر نے اپنے افسانوں میں عصری مسائل کے علاوہ عورتوں کی نفسیات، جذبات و احساسات، اُن کی دم توڑتی خواہشیں، ان پر برپا ہو رہے مظالم، اُن کی قربانیوں اور اُن کے روز و شب کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔جن افسانوں کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں، اُن کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نور ظہیر ایک جینوئن اور خالص ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔وہ اپنی کہانیوں کو برملا 'سچی کہانی' کہتی ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے۔وہ اپنی کہانیوں سے چونکانے کی بجائے جھنجھوڑنے کا کام لیتی ہیں۔نور ظہیر کے افسانوی اسلوب، منظر نگاری، مکالمے پر اُن کی گرفت، پلاٹ اور کردار کا انتخاب، اس بات کا اعلانیہ ہیں کہ وہ اردو کی ایک بڑی اور اہم افسانہ نگار ہیں۔□□□

**Dr. Tasleem Arif**
Assistant Professor & Coordinator
Deptt. of Urdu,
West Bengal State University,
Berunanpukuria, Malikapur, Barasat,
North 24 Parganas, Kolkata-700126 (W.B)
Mobile: 7003350449 / 9339116285

سوپریا سنگھ 'وینا'

# غزلیں

سہارا ڈھونڈھ مت اے دل سہارا مار ڈالے گا
بھنور سے بچ بھی نکلا تو کنارا مار ڈالے گا

محبت کی یہ آخر کون سی تصویر ہے ہمدم
مجھے دوری نہیں، ملنا تمھارا مار ڈالے گا

جسے سب عشق کہتے ہیں، ہے میری جان کا دشمن
اگر میں جی گئی تو یہ دوبارہ مار ڈالے گا

جنھیں ہم اپنا کہتے ہیں جو ہم کو جاں سے پیارے ہیں
ان ہی میں سے کوئی ہم کو ہمارا مار ڈالے گا

منافع ڈھونڈتی ہے کارو بار عشق میں وینا
ارے یہ عشق ہے اس کا خسارہ مار ڈالے گا

کتنا مشکل ہے مصیبت یہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گزارا کرنا

زندگی رنج و الم ہم تو ترے سہہ لیں گے
تو یہ برتاؤ کسی سے نہ دوبارہ کرنا

دل نے سو بار مری خیر خبر لی ہوتی
درد دل کا میں اگر جانتی چارہ کرنا

کتنا مشکل ہے رکھیں باندھ کے دل کو اپنے
کتنا آساں ہے مگر اپنا خسارہ کرنا

ساتھ کچھ دن تو رہو آپ بھی سب کے جیسے
آئے وینا جو مصیبت تو کنارا کرنا

**Supirya Singh**
Sector-1, House No. 217
Chiranjeev Vihar
Ghaziabad-201002 (U.P)

# غزلیں

رچنانرمل

میں نے اس کو سخن میں ڈھالا تھا
جس نے میرا سکون چھینا تھا

حال جب اس نے رک کے پوچھا تھا
شعلۂ درد دل میں بھڑکا تھا

بند پنجرے سے کل پرندے نے
آسماں حسرتوں سے دیکھا تھا

رات بستر پر چاند کے یارو
ایک تارا اداس بیٹھا تھا

میری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
سامنے خود وہ وہ میرے آیا تھا

لے گیا کل بہا کے جو مجھ کو
تیری یادوں کا ایک دریا تھا

اس کا کہنا کہ پھر ملیں گے ہم
زندگی کا یہی سہارا تھا

سر پہ الزام کس کے دوں نرمل
مجھ کو میرے ہی دل نے مارا تھا

**Rachna Bhatia**
202/A 3rd Floor
Arjun Nagar Safdarjung Enclave
New Delhi-110029

شہناز رحمت

میں عام سی ہوں بنائے نہ شاہکار مجھے
بنا بنا کے مٹاتا ہے کیوں کمہار مجھے

میں منتظر ہوں زمانے سے مجھ کو رہنے دے
کہا ہے میں نے کبھی کیا کہ اب پکار مجھے

میں کوئی دھوپ نہیں ہوں اندھیری رات نہیں
سہانی شام ہوں یوں ہی کبھی گزار مجھے

ہے پھول پھول پہ کیسی عجب سی ویرانی
خزاں رسیدہ لگے ہے یہ کیوں بہار مجھے

عجب سا ایک تلاطم ہے مجھ میں بےچینی
الٰہی کیوں نہیں آتا کبھی قرار مجھے

میں مشت خاک ہوں سحرا کی زرد مٹی ہوں
بنا نہ اس طرح راہوں کا تو غبار مجھے

وہ ایک ننھی سی چڑیا حسین گوریا
بھلی سی لگتی بہت جس کی چوں چکار مجھے

میں آسمان میں اڑتے ہوئے انہیں دیکھوں
زمیں کے سارے پرندوں سے کتنا پیار مجھے

میں بات بات پہ شہناز خوف کھاتی ہوں
میں جانتی ہوں نہیں موت سے فرار مجھے

**Shahnaz Rahmat**
Swayamsiddha
Room no 102,IA Market Road
Sector 3,Salt lake
Kolkata-700097 (West Bengal)
Mobile:8013055406

ڈاکٹر نشاں زیدی

# نیک انسان

صبح سے بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور آمنہ کا درد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ نائلہ آج بھی کالج نہیں گئی تھی۔ آمنہ کی کراہنے کی آواز سے اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ ہر وقت مشین کی طرح کام کرنے والی آمنہ چھوٹے موٹے درد کو تو ایسے ہی ٹال دیتی تھی۔

''میرا درد بڑھتا جا رہا ہے، سوچ رہی ہوں کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھادوں۔'' آمنہ نے دبے دبے لہجے میں صبح جاوید سے کہا بھی تھا۔

''میں کیا کروں۔'' انھوں نے بے رخی سے جواب دیا اور دروازہ کھول کر تیزی سے نکل گئے۔

آمنہ آنکھوں میں آئے ہوئے اُنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

جاوید کی کپڑے کی دکان ٹھیک ٹھاک چلتی تھی لیکن وہ اپنی آمدنی کا کیا کرتا تھا کسی میں پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ بس پہلی تاریخ کو گھر میں راشن کا سامان لاکر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ باقی گھر میں کیا خرچ ہونا ہے کچھ نہیں پتہ۔ ہاں کبھی کبھار جب کسی چیز کا کھانے کا اپنا ہی دل ہوتا تو لاکر دے دیتا۔ صبح سے شام تک آمنہ سلائی کرتی اور جو پیسہ آتا اسے دونوں بچوں کی پڑھائی میں لگا دیتی۔ کبھی اپنے اوپر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتی۔ تہوار وغیرہ پر جو پیسہ میکے سے آتا وہ بھی بچوں کے اخراجات میں لگ جاتا۔ اس بار آمنہ کے پاس سلائی کا کام زیادہ آگیا تھا کیونکہ اس نے بچوں کی یونیفارم سینے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ سوچا تھا اس گرمی میں ایک کولر لے لے گی تو بچوں کو گرمی سے راحت مل جائے گی۔ کیونکہ جاوید سے تو وہ کئی بار کہہ چکی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ الٹا جواب دیتا تھا۔ آج کل گرمی بھی ایسی قیامت کی پڑتی ہے پنکھے میں تو چین بھی نہیں پڑتا۔ لیکن بیماری ایسی لگی کہ سارا پیسہ خرچ ہوگیا اور درد ایک بھاری پتھر کی مانند اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''نائلہ نائلہ کھانا تیار کرلیا بیٹا۔''

''امی بس روٹی رہ گئی ہے۔'' اس نے گیس پر رکھے کوکر میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔

''جلدی پکالے تیرے ابا نماز پڑھ کر آتے ہی ہوں گے۔''

''اف امی ابا ابا...... ایسے چاہت جتاتی ہیں جیسے وہ ان کے بہت بڑے عاشق ہیں یا ان کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔'' نائلہ کے بولنے سے پہلے ہی راشد بول اٹھا۔

''راشد بیٹا ابا کو ایسا نہیں کہتے۔'' بیٹا تمھاری پڑھائی کا خرچ تو وہ ہی اٹھاتے ہیں۔

''بس کریں امی! بس اسکول میں داخلہ دلا دیا اور کورس دلا دیا۔ یہ نہیں پتہ کہ اسکول کے اور بھی خرچے ہوتے ہیں۔'' نائلہ نے توے پر روٹی ڈالتے ہو کچن سے کہا۔

دروازے پر دستک ہوتے ہی سب خاموش ہوگئے تھے۔ جاوید کے ہاتھ میں چھوٹی سی تھیلی میں کچھ تھا۔ نائلہ کو دے کر آرام سے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کر کے چائے پی کر چلے گئے۔ جاوید کا یہ معمول تھا صبح اٹھ کر نہا دھو کر دکان پر چلے جاتے اور دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے گھر آتے اور پھر رات میں نو بجے آکر کھانا کھا کر سو جاتے۔ دن میں گھر میں کیا ہوا کیا نہیں کس کو کس بات کی ضرورت ہے کچھ مطلب نہیں۔ گھر میں بس ضرورت بھر کی بات کرتے۔

''ہاں آپی صحیح کہہ رہی ہیں اور ایسا نہیں ابا کی دکان خوب چلتی ہے مین مارکیٹ میں دکان ہے۔'' راشد کو بھی آج سارے شکوے یاد آ رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوتے ہی سب خاموش ہوگئے تھے۔ جاوید کے ہاتھ میں چھوٹی سی تھیلی میں کچھ تھا۔ نائلہ کو دے کر آرام سے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کر کے چائے پی کر چلے گئے۔ جاوید کا یہ معمول تھا صبح اٹھ کر نہا دھو کر دکان پر چلے جاتے اور دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے گھر آتے اور پھر رات میں نو بجے آ کر کھانا کھا کر سو جاتے۔ دن میں گھر میں کیا ہوا کیا نہیں کس کو کس بات کی ضرورت ہے کچھ مطلب نہیں۔ گھر میں بس ضرورت بھر کی بات کرتے۔

''نائلہ! ابا کچھ شام کے پکانے نے کے لیے لائے ہیں۔'' آمنہ کے درد میں کچھ کمی تھی۔

''ہاں امی وہ قیمہ لائے ہیں شام کو میں قیمہ بنالوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔ صبح سے گھر کے سارے کام کرتے کرتے وہ پوری طرح تھک چکی تھی۔ سب کے ابا اپنے بیوی بچوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ایک ہمارے ابا...... ہمارے گھر میں ایک کولر بھی نہیں پوری گرمی پنکھے میں گزارنا پڑتی ہے۔ اسی طرح کے بہت سے خیالات اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح وار کرتے رہتے۔ یہ سب سوچتے سوچتے اس کو کب نیند آ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ سو کر جب اٹھی تو دیکھا، امی سل پر قیمہ پیس رہی ہیں۔

''امی یہ کیا حماقت ہے۔؟'' اف اتنا درد اور آپ یہ...... اس کو بہت تیز غصہ آ رہا تھا۔''

''نائلہ تیرے ابا کو سل پر پسے گوشت کے کوفتے ہی پسند ہیں اور وہ یہ قیمہ کوفتوں کے لیے ہی لائے تھے۔'' آمنہ نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

''امی کیا کہوں ہر وقت ابا ابا...... ابا کو یہ پسند ہے، ابا کو وہ پسند ہے اگر ابا سمجھتے ہوتے تو نا جانے کیا حال ہوتا۔ امی جائیے جا کر لیٹیے۔'' اس نے پسا ہوا گوشت اٹھاتے ہوئے کہا۔

آمنہ کمر پکڑ کر اپنے پلنگ کی طرف بڑھ گئی۔ کونے میں ایک اسٹول پر ٹیبل فین رکھا تھا، اس کے آگے آمنہ کا پلنگ تھا اور تھوڑے فاصلے پر صوفہ سیٹ پڑا تھا، برابر میں ایک الماری تھی جس میں راشد اور نائلہ کی کتابیں رکھی تھیں۔ اس کے ہی برابر میں ایک کرسی پڑی تھی جس پر نائلہ کا بیگ رکھا تھا اور دو کتابیں رکھی تھیں۔

''امی لیجیے درد کی دوا کھا لیجیے۔ نائلہ نے پانی کا گلاس آمنہ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

''نائلہ تم اس دن زیبا کے گھر گئی تھیں کیا ہوا۔ زیبا کو لڑکے والے بھی تو دیکھنے آ رہے تھے۔'' آمنہ نے ٹیبلیٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ آمنہ کی یہ پرانی عادت تھی جب اس کو محسوس ہوتا کہ بچے گھر کے ماحول سے ٹینشن میں ہیں تو کوئی دوسری بات چھیڑ دیتی۔

''ارے ہاں امی وہ تو میں بتانا ہی بھول گئی۔'' اس دن ڈاکٹر کا پرچہ دیکھ کر میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے پورے دس ہزار کے ٹیسٹ جو لکھ دیے تھے اور اوپر سے دوا اتنی مہنگی۔''

''چل چھوڑ تو زیبا کا بتا۔'' آمنہ نے تکیہ درست کیا۔

''امی زیبا کو لڑکے نے بھی دیکھا اور اس کے ماں باپ نے بھی۔ آنٹی نے لڑکے والوں کی خوب خاطر مدارات کی۔''

''اچھا زیبا ان کو پسند آئی۔''

''ہاں امی زیبا بھی پسند آئی۔''

''اچھا تو پھر تو رشتہ طے ہو گیا ہوگا ویسے زیبا ہے بہت پیاری۔''

''نہیں امی رشتہ تو طے نہیں ہوا۔''

''کیوں جب سب پسند آ گیا تو طے کیوں نہیں ہوا؟'' آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

امی لڑکے کی ماں اتنی عجیب تھیں۔ جب سے گھر میں داخل ہوئیں

تو بس یہی باتیں کرتی رہیں کہ پڑوس والوں کی بہو اتنی اچھی ہے۔اپنے ساس سسر کی بہت خدمت کرتی ہے۔صبح صبح سب کو بستر پر چائے دیتی ہے۔ساس کو کسی کام میں ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔پہلے تو اسی طرح کی باتیں کرتی رہیں۔پھران کا سیدھا رخ زیبا کی طرف ہو گیا۔اس سے ایک ایک چھوٹی چھوٹی بات پوچھ رہی تھیں کہ بریانی بنانا آتی ہے،قورمہ بنانا آتا ہے۔انگلش بول لیتی ہو۔صبح کتنے بجے اٹھتی ہو۔اورتو اور یہ بھی پوچھ لیا باہر کا کھانا پسند ہے یا گھر کا کھانا زیادہ پسند ہے۔بس زیبا پہلے تو صحیح صحیح جواب دیتی رہی پھر بعد میں اس نے کہہ دیا آپ کے صاحب ادے کو کیا کیا آتا ہے۔بس کیا تھا وہ تو بپھر گئیں۔''ابھی سے اتنی تیزی دکھا رہی ہے بعد میں کیا کرے گی۔امی بڑا مزا آیا وہ ایسے پیر پٹختی ہوئی گئیں۔''

''ارے یہ تو غلط ہوا؟''

''ارے امی کچھ غلط نہیں ہوا۔صحیح کہہ رہی تھیں زیبا کی آپی۔وہ تو کچھ معاملات اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں نا تو لوگوں کا بس نہ چلے کہ سب بہو کے اوپر ہی ڈال دیں۔جیسے بیماری ہی دیکھ لیجیے۔وہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے نہیں تو لوگ کہہ دیتے کیسی بہو ہے ساس کی بیماری بھی نہیں لے سکتی ساس بیچاری بیمار ہے اور خود ہٹی کٹی گھوم رہی ہے۔''

''بس کرنائلہ اٹھ جا ابا آنے والے ہوں گے۔نائلہ کی باتوں سے آمنہ کا درد تو نہیں رکا تھا لیکن طبیعت تھوڑی بہل گئی تھی۔''آمنہ درد کی دوا کھا کر سو گئی تھی۔راشد کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

معمول کے مطابق جاوید کھانا کھا کر ٹی وی پر نیوز دیکھ رہے تھے۔

''ابا آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''نائلہ نے سامنے کرسی کو کھسکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو۔''جاوید نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''وہ ابا امی کے کچھ ٹیسٹ ہونا ہیں۔ڈاکٹر نے کڈنی میں انفیکشن کا شبہ ظاہر کیا ہے۔''اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو مجھے تو فرصت ہے نہیں۔تم کرا لو۔''جاوید کی نظریں اب بھی ٹی وی پر ہی تھیں۔

''وہ ابا میں چلی تو جاؤں گی لیکن پیسے۔ڈاکٹر نے دس ہزار روپے بتائے ہیں۔''

''ننیہال والوں کو بتاؤ۔انھیں نہیں بتایا،وہی تو تمھارے سارے اخراجات پورا کرتے ہیں۔ہوں......''جاوید کے لہجے میں تلخی تھی۔

''وہ ابا کا منہ دیکھتی رہی۔امی نے کتنا منع کیا تھا کہ ابا سے پیسوں کی بات نہیں کرنا۔لیکن کیوں کیوں......اسی طرح کے بہت سے سوال اس کو بے چین کیے ہوئے تھے۔

آمنہ کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔نائلہ نے آج پھر چھٹی کر لی تھی۔راشد کو اس نے اسکول بھیج دیا تھا۔ابا بھی ناشتہ کر کے دکان پر چلے گئے تھے۔نائلہ کئی بار اس پرچہ کو دیکھ چکی تھی جس میں آمنہ کے ٹیسٹ لکھے تھے۔جب کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو اس نے زیبا کو فون کیا۔زیبا کی امی نے ڈاکٹر احسن کے بارے میں بتایا جن کی فیس بھی معمولی تھی اور انھوں نے بتایا تھا کہ وہ ٹیسٹ بھی زیادہ نہیں بتاتے ہیں۔ڈاکٹر احسن کا نام سن کر اس کو کچھ تسلی بھی ہوئی تھی۔چلو کوئی تو راستہ نکلا۔

ڈاکٹر احسن کے کلینک پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ریسیپشن پر بیٹھے لڑکے نے پرچہ بنا کر اندر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔نائلہ امی کو سہارا دے کر اندر لے جا رہی تھی کہ ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی نائلہ نے امی کو اور امی نے نائلہ کو بغور دیکھا۔؟؟

''اچھا ڈاکٹر صاحب چلتا ہوں۔مغرب کا وقت ہو رہا ہے۔''
کہتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے جاوید ڈاکٹر کے کیبن سے نکل رہے تھے،آمنہ کو دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک گئے۔

''ابا......نائلہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے نکل گئے۔

''آپ انھیں جانتی ہیں۔''ڈاکٹر نے آمنہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی......''آمنہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نائلہ نے جواب دیا۔

''بڑے نیک انسان ہیں بہت ہی مذہبی،عبادت گزار۔میری دکان پر تو اکثر آتے ہیں۔بڑی پابندی سے نماز پڑھتے ہیں۔ابھی مسجد بنی ہے اس میں پورا پچاس ہزار کا چندا دیا ہے۔''

''ہاں ڈاکٹر صاحب اور انھوں نے نمازیوں کے لیے ایئر کنڈیشن لگوانے کے لیے بھی کہا ہے''۔پرچہ بنانے والا لڑکا بھی اندر آ گیا تھا۔

''ہاں ابھی وہی تو بتا رہے تھے ان کی کوئی کمیٹی نکلنے والی ہے۔واقعی نمازیوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''جی......جی......''آمنہ کے منہ سے بس اتنا نکلا۔

□□□

**Nisha Khatoon**
B-63/S-2 DLF Colony
Sahibabad
Distt.Ghaziabad -201005(U.P)
Mob: 9873297860

رنکل شرما
ہندی کہانی کا اردو ترجمہ
مترجم: خورشید عالم

# پیارا سا ٹھگ

گرمی کی دوپہر بھی بڑی سُستی بھری ہوتی ہے۔ سارے کام نمٹا کر ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پہلے سوچا ان سنا کردوں، لیکن پھر سوچا اس وقت نہ جانے کون ہوگا؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک نوجوان لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ لمبا قد، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، جسم پر صاف ستھری آسمانی رنگ کی شرٹ اور کالی پینٹ پہنے ہوئے اور ہاتھ میں ایک فولڈر تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آرہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑی شائستگی سے نمستے کیا تو میں نے بھی رسماً اپنی گردن ہلادی۔

"کس سے ملنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "جی، میرا نام ابھینو ہے۔ میں نگرنگم کے دفتر سے آیا ہوں۔۔ مجھے مسٹر شرما سے ملنا ہے۔"

"لیکن وہ تو ابھی گھر پر نہیں ہیں۔ آپ شام کو یا پھر کل صبح آ کر مل سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ بولا "اوہ! جی دیکھیے، بہت ضروری کام ہے۔ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ اندر آکر آپ کو سب بات تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

کسی انجان شخص کو گھر کے اندر بلانے کی سوچ کر ہی مجھے تھوڑی گھبراہٹ ہوئی، لیکن پتہ نہیں کیوں جب نظر اس کے چہرے پر پڑی، تو یکبارگی منہ سے "ہاں" نکل گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، اندر آجاؤ۔"

وہ اندر آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی میڈم، ایک گلاس پانی ملے گا؟"

اف! میں بھی کیسی بھلکڑ ہوں،؟ گھر آئے مہمان کو پانی کے لیے بھی نہیں پوچھا،" ابھی لائی۔" کہہ کر میں پانی لینے چلی گئی۔ ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے میں ڈرائنگ روم آئی تو دیکھا، وہ کمرے میں دیوار پر ٹنگی ایک پینٹنگ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی میرے قدموں کی آہٹ سنی، تو تھوڑا سہم گیا۔

میں نے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھایا تو اس نے پوچھا،

"میم یہ پینٹنگ آپ نے بنائی ہے؟"

میں نے "ہاں" میں اپنا سر ہلادیا۔

"آپ ہی کی طرح بہت خوبصورت ہے۔ میم، آپ کو تو اپنی پینٹنگ کی ایگزیبیشن لگانی چاہیے۔ سچ! بہت ہی سندر پینٹنگ ہے۔"

"تھینک یو! بس، ایسے ہی شوق ہے اسی کچھ نہ کچھ بنادیتی ہوں۔ لیکن آپ بتائیے راجیو سے کیا کام تھا۔"

"میم، دراصل مجھے شرماجی نے بہت دنوں سے ایک لڑکے کی نوکری کے لیے بولا ہوا تھا۔ آپ کے یہاں شاید کوئی لڑکا ہے، جسے نوکری کی ضرورت ہے۔ میم، ہمارے آفس میں ایک پوسٹ خالی ہے۔ لیکن آج

اس کے رجسٹریشن کے لیے آخری دن ہے۔ اگر آج چار بجے تک فارم نہیں بھرا گیا تو نوکری ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

اس کی بات سن کر میں سمجھ گئی کی ہو نہ ہو یہ سنیل کے لیے نوکری کی بات کر رہا ہے۔ دراصل ایک مہینے سے راجیو کا چچیرا بھائی سنیل ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے، اور نوکری بھی ڈھونڈ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے یوں ہی کہا، ''نوکری! لیکن راجیو نے تو مجھے ایسا کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''نہیں بتایا (چونکتے ہوئے) لیکن وہ تو پچھلے ایک مہینے سے لگاتار مجھ سے کہہ رہے تھے۔ میں صبح سے مسٹر شرما کو کال کر رہا ہوں، لیکن انھوں نے میرا فون نہیں اٹھایا۔ شاید وہ بیزی ہوں گے، کیا انھوں نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا؟''

نہ جانے کیوں، اس کے الفاظ مجھے اندر تک زخمی کر گئے۔ سچ تو یہی ہے کہ راجیو کو فرصت ہی کہاں مجھ سے کچھ کہنے یا سننے کی، جو وہ فون اٹھائے۔ اب کل ہی کی تو بات ہے، آفس ٹائم پر میں نے ایک فون کیا کر لیا ، کہ گھر آ کر طوفان کھڑا کر دیا۔ کہنے لگے، ''میٹنگ تھی بہت ضروری اور تم نے اسی وقت فون کھٹکھٹا دیا۔ تم تو سارا دن گھر بیٹھی رہتی ہو، باہر جاؤ تو پتہ لگے کہ پیسے کمانا کتنا مشکل ہے۔''

ہوں! میٹنگ۔۔۔ میٹنگ میں بیزی ہوں گے، اچھی طرح سے جانتی ہوں، آٹھ سال سے سب جانتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں خاموش ہوں؟ ہر روز تمھارے کپڑوں میں سے کسی اور کی خوشبو آتی ہے، لیکن پھر بھی خاموش ہوں؟ آفس ٹور کا بہانا کر کے ہر دوسرے دن تمھارا اس عورت کے ساتھ جانا، سب جانتی ہوں، مگر پھر بھی انجان بنی رہتی ہوں۔ صرف اس امید پر کہ ایک نہ ایک دن تم میرے پاس پھر سے لوٹ آؤ گے۔ راجیو، تم نے ہی تو کہا تھا نہ کہ شادی کے بعد ایک گھر کی ذمہ داری سنبھالے گا اور دوسرا باہر کی ذمہ داری یعنی کام کرے گا۔ اسی لیے میں نے اپنی اچھی خاصی نوکری چھوڑ دی اور آج تم مجھے کمانے کا طعنہ دے رہے ہو۔ اتنا کہتے ہی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"لو جی اب ہو گیا ڈرامہ شروع، بات بات پر تم عورتیں بس رونے بیٹھ جاتی ہو۔'' کہتے ہوئے راجیو باہر نکل گئے۔

''میم۔۔۔ میم۔۔۔ کہاں کھو گئیں آپ؟'' اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی جس سے میری غفلت اوجھل ہوئی۔

''نہیں، کہیں نہیں، ہاں! تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''جی وہ آج آخری دن ہے۔۔۔''

''اچھا! تو اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، اس لڑکے کو، میرے ساتھ، اپنے سارے ڈاکیومینٹس کی کاپی اور پانچ ہزار روپے لے کر چلنا ہوگا۔ وہاں رجسٹریشن فارم بھر کر جمع کرنا ہے۔ پھر بعد میں انٹرویو کا لیٹر آ جائے گا، تب انٹرویو دینا ہے۔''

''لیکن اس وقت یہ کیسے ممکن ہے؟ راجیو تو آفس گئے ہوئے ہیں، اور وہ لڑکا، سنیل بھی کہیں اور انٹرویو کے لیے گیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو میم، آپ چاہیں تو آپ بھی میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔ آپ فارم جمع کرا دیجیے گا، باقی فارملٹیز بعد میں پوری ہو جائیں گی۔''

نہ جانے کیوں، اس کے الفاظ مجھے اندر تک زخمی کر گئے۔ سچ تو یہی ہے کہ راجیو کو فرصت ہی کہاں مجھ سے کچھ کہنے یا سننے کی، جو وہ فون اٹھائے۔ اب کل ہی کی تو بات ہے، آفس ٹائم پر میں نے ایک فون کیا کر لیا ، کہ گھر آکر طوفان کھڑا کر دیا۔ کہنے لگے، "میٹنگ تھی بہت ضروری اور تم نے اسی وقت فون کھٹکھٹا دیا۔ تم تو سارا دن گھر بیٹھی رہتی ہو، باہر جاؤ تو پتہ لگے کہ پیسے کمانا کتنا مشکل ہے۔"

میں تذبذب میں پڑ گئی۔ کیا کسی انجان پر اس قدر بھروسہ کرنا ٹھیک ہوگا؟ تبھی ذہن میں آیا کیوں نہ راجیو کو فون کروں؟ لیکن نہ جانے کیوں ہاتھ رک گئے؟ ویسے بھی اگر کرتی بھی تو کون سا راجیو فون اٹھاتے؟ بڑی الجھن تھی لیکن سنیل کا خیال آتے ہی سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک اچھا موقع ہاتھ سے چلا جائے۔ سنیل اس شہر میں کتنی امیدیں لے کر آیا ہے۔ اسی الجھن کے درمیان میری نظریں اس نوجوان پر جا ٹکیں، جو کبھی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا تو کبھی دیوار پر ٹنگی پینٹنگ کو۔

اف! کتنی معصومیت ہے اس کے چہرے پر، یہ بھلا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں کچھ تو ایسا ہے اس کے اندر جو مجھے اپنی جانب متوجہ کیے جا رہا ہے۔

''میم! کیا سوچا آپ نے؟ اچھا رہنے دیجیے، میں چلتا ہوں۔ ایسے موقع تو پھر بھی آتے رہیں گے۔'' اس کا جانے کی بات کہنا میرے دل کو ہلا گیا۔ من نے ٹھان لیا کہ اس کے ساتھ جانا ہے۔

''رکیے! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ بس ابھی دومنٹ میں آئی۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔

''جی بہت اچھا، آپ ساتھ چل کر خود ساری فارملٹیز پوری کیجیے گا جس سے آپ کو اطمینان ہو سکے۔''

''اطمینان کی بات کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے پلیز۔'' کہہ کر میں اندر چلی گئی۔ الماری میں رکھے کپڑوں میں، یکبارگی ہاتھ، اس گلابی ساڑی پر جا کر ٹھہر گیا جو راجیو نے مجھے، میری پہلی سالگرہ پر گفٹ کی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ سے کپڑے بدل کر، پرس میں روپیے اور ضروری کاغذات رکھے اور باہر آنے سے پہلے آئینہ میں خود کو اچھی طرح دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں آج بہت دنوں بعد، خود پر ہی پیار آ رہا تھا۔ تیار ہو کر میں باہر آ گئی۔

''چلیں؟''

''جی چلیے۔''

باہر نکل کر ہم سیدھے بس اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ جیسے ہی بس آئی، اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بس میں چڑھنے میں مدد کی۔ بس میں بھیڑ ہونے کی وجہ سے سیٹ خالی نہیں تھی۔ میں بس میں ایک طرف کھڑی ہو گئی، وہ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں پرس تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے بس کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا۔ بس کی کھڑکی سے تیز ہوا آ رہی تھی، جس کی وجہ سے میرے بالوں کی ایک لٹ، میرے چہرے پر آ رہی تھی جو مجھے بار بار پریشان کر رہی تھی۔ میری پریشانی کو شاید اس نے بھانپ لیا۔ اس نے، اپنے ہاتھ سے میری لٹ کو میرے کانوں کے پیچھے کیا۔ اس کے ہاتھوں کے اس لمس سے میرے پورے جسم میں ایک عجب سی لہریں اٹھیں۔ اس کے جسم سے آتی بھینی بھینی سی خوشبو کو میں محسوس کرنے لگی۔ وہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن میں، چور نظروں سے بار بار اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے اس کے بھی بال ہوا میں اڑ رہے تھے جنھیں وہ بڑے ہی سلیقے سے اپنے ہاتھ سے سنوار لیتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی اس میں، لیکن کچھ تو تھا جو روح کو ایک عجیب سا سکون دے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا ساتھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ یہ سفر یوں ہی چلتا رہے۔ تبھی بس رکی اور وہ بولا،

''میم، چلیے ہمارا اسٹاپ آ گیا۔''

بس سے اتر کر ہم سیدھے نگر نگم کے دفتر جا پہنچے۔

''میم، آپ یہیں رکیے! میں فارم لے کر آتا ہوں۔'' کہہ کر وہ چلا گیا۔

قریب پانچ منٹ بعد ہاتھ میں ایک کاغذ لیے وہ واپس آیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''لیجیے میم، آپ یہ فارم بھر دیجیے۔ لیکن میم، وقت بہت کم بچا ہے، اگر آپ کہیں، تو جب تک آپ یہ فارم بھریں گی، تب تک میں رجسٹریشن فیس جمع کرا دیتا ہوں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ یہ لیجیے روپیے۔'' میں نے جھٹ سے پانچ ہزار روپیے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔

پیسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے غور سے میری طرف دیکھا، پھر کچھ سوچ کر چلا گیا۔ میں فارم بھرنے میں مصروف ہو گئی۔ فارم بھرنے کے بعد میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ بہت دیر ہو گئی تو میری نظریں چاروں طرف اسے ڈھونڈنے لگیں۔ لیکن، وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ گھڑی میں دیکھا تو پانچ بجنے ہی والے تھے۔ سرکاری دفتر میں لوگ پانچ بجے سے ہی گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں اٹھ کر سامنے آفس کے اندر گئی۔ ایک صاحب اپنی کرسی پر مزے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا،

''جی، یہاں جو ابھینو کام کرتے ہیں، وہ کہاں ملیں گے؟''

ان صاحب نے مجھے اوپر سے نیچے تک ایسے دیکھا جیسے میں نے کوئی بہت ہی عجیب سا سوال کیا ہو، اپنے منہ میں دبے پان کی پیک کو سنبھالتے ہوئے بولے ''کون ابھینو، میڈم جی؟ یہاں تو اس نام کا کوئی آدمی کام نہیں کرتا ہے۔''

''کوئی نہیں ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو میرے ساتھ آئے ہیں۔ یہاں کلرک کی نوکری نکلی ہوئی ہے، اسی کے درخواست کے لیے انھوں نے مجھے یہ فارم دیا اور وہ خود رجسٹریشن فیس جمع کرنے ادھر آئے تھے۔'' پریشانی اور گھبراہٹ میرے چہرے پر صاف جھلک رہی تھی، جو کہ شاید ان صاحب نے بھی بڑی آسانی سے پڑھ لی تھی۔

''دیکھیے، میڈم جی، 25 سالوں سے میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ یہاں ابھینو نام کا کوئی بھی شخص کام نہیں کرتا ہے۔ اور رہی بات نوکری کی، تو پچھلے دو سال سے یہاں کوئی ویکنسی نہیں آئی ہے۔''

''لیکن۔'' اس سے زیادہ لفظ میرے منہ سے نکلے ہی نہیں۔

''دیکھیے میڈم جی، برا مت مانیے، لگتا ہے کوئی آپ کو ٹھگ کر چلا گیا ہے۔ یہاں آپ جیسے بہت سے لوگ آتے ہیں، جو اس طرح کی ٹھگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ہم کو تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ کیسے ان ٹھگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں؟''

وہ صاحب بولتے رہے لیکن مجھے ان کے الفاظ دھیرے دھیرے سنائی دینے بند ہو گئے۔ میں بے جان سی، تھکے ہوئے قدموں سے واپس گھر کے لیے چل پڑی تھی۔ راستہ کب ختم ہو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ سارے راستے میں یہی سوچتی رہی کہ کیا واقعی وہ ٹھگ تھا؟ کیا سچ مچ اس نے مجھے

دھوکا دیا؟ وہ معصوم سا چہرہ، وہ چمکتی سی آنکھیں اور وہ میٹھی سی مسکان، کیا سب چھلاوہ تھا؟ اگر وہ ایک ٹھگ تھا تو اسے میرے گھر کے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے معلوم تھا؟ نہیں نہیں وہ ٹھگ کیسے ہوسکتا ہے؟ انھیں الجھنوں میں الجھی ہوئی، میں گھر کب پہنچ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ تبھی پیچھے سے ایک کرخت سی آواز کانوں میں پڑی ''رادھیکا۔۔۔'' پیچھے مڑ کر دیکھا تو، مسز گپتا آواز دے رہی تھیں۔

''رادھیکا، آج ایک نوجوان لڑکا آیا تھا، کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی ورما جی رہتے ہیں، انھیں نوکری کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ ورما جی تو یہاں کوئی نہیں رہتے لیکن ہاں، یہاں پاس ہی میں، دو مکان چھوڑ کر ایک راجیو شرما جی رہتے ہیں، لیکن ان کی تو اچھی خاصی نوکری ہے انھیں بھلا نوکری کی کیا ضرورت؟ لیکن ہاں ان کے یہاں ایک لڑکا آیا ہوا ہے شاید وہ نوکری ڈھونڈ رہا ہے۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ وہ تم سے جا کر مل لے اور وہ تمھارے گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ تم سے ملا کیا؟ نوکری کی بات ہوئی کیا؟''

مسز گپتا اپنے سوالوں کی جھڑی لگائے ہوئی تھیں، لیکن میری سمجھ میں اب سب کچھ آچکا تھا مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر اس نے ٹھگا کیا؟ پیسے؟ یا شاید اس سے بھی زیادہ کچھ اور؟ من میں یہ سوال اٹھتے رہتے ہیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں آج بھی بھیڑ میں نظریں اس ٹھگ کو ڈھونڈتی ہیں؟ کاش! وہ ایک بار پھر مل جائے، وہ ٹھگ، وہ پیارا سا ٹھگ۔

□□□

Dr. Khursheed Alam
F-23/6C, iind Floor, Shatabdi Enclave
Barola, Sector 49
Noida-201301 (UP)

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................... بتاریخ...............................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ..........................................................................................

پتہ : ..........................................................................................

..........................................................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

# لذیذ پکوان

## قلاقند

**اجزا:** کھویا پانچ سو گرام چینی ایک سو پچیس گرام،
الائچی پانچ عدد
بادام، پستے تین کھانے کے چمچ
چاندی کا ورق حسب ضرورت

**بنانے کی ترکیب:** ایک پین میں کھویا ڈال کر اس کو چار سے پانچ منٹ تک اچھی طرح پکالیں اور چمچ چلاتیں رہے۔
اب اس میں چینی ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں جب تک پگھل نہ جائے۔ اب اس میں الائچی کے بیج ڈال کر پکائیں۔
پھر اس کو ٹھنڈا کر کے بادام، پستے اور چاندی کے ورق سے گارنش کرلیں۔
جم جائے تو اس کے پیسز کر کے سرو کریں۔

## چوکو منٹ فج

**اجزا:** چاکلیٹ پانچ سو گرام (باریک کٹی ہوئی)
کنڈینسڈ ملک چار سو گرام، مکھن ساٹھ گرام، منٹ ایسنس ایک چائے کا چمچ، مِلک چاکلیٹ سو گرام (پگھلی ہوئی)

**بنانے کی ترکیب:** ایک برتن میں باریک کٹی چاکلیٹ، کنڈینسڈ ملک اور مکھن ڈال کر پکائیں۔

مسلسل چمچ چلاتے رہیں یہاں تک کہ تمام چیزیں پگھل کر اچھی طرح مکس ہو جائیں۔

اس میں منٹ ایسنس شامل کریں۔

اب اس آمیزے کو گریس کیے ہوئے چوکور پین میں پھیلا کر ڈالیں۔

اب اسے جم جانے تک فریج میں رکھیں۔

اب اسے چوکور ٹکڑوں میں کاٹ کر پگھلی ہوئی ملک چاکلیٹ سے سجائیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

## مربہ، جیلی، شکر کیک

**اشیا:** بورا شکر چار اونس

دانہ دار شکر تین اونس

انڈے دو عدد

مربہ پانچ بڑے چمچ

میدہ چار اونس، مارجرین چار اونس، کوکو پاؤڈر پون اونس،

**بنانے کی ترکیب:** چھ انچ کے ٹین کے اندر سے چکنا کریں۔

اس کے بعد اس پر چکنائی نہ جذب کرنے والا غذا لگائیں۔

مارجرین کو شکر کے ساتھ ملائیں کہ وہ ریشہ دار ہو جائے۔

انڈوں کو پھینٹیں اور آہستہ آہستہ مکسر میں ملائیں۔

مکسچر کو دو حصوں میں تقسیم کریں اور دو اونس میدہ کو مکسچر کے آدھے حصہ پر چھڑکیں۔

چمچے سے چلائیں اور بچیں باقی میدہ اور کوکو پاؤڈر کو دوسرے مکسچر کے آدھے حصے پر چھانیں اور اچھی طرح چلائیں اور لپیٹیں۔

آدھے مکسچر کو ٹین میں ڈالیں اور آدھے ڈھک دیں۔

باقی مکسچر کو دوسرے ٹین میں ڈالیں اور سادہ مکسچر کو اوپر رکھیں۔

ہلکی آنچ کے تنور پر پچیس منٹ پکائیں۔

نکال کر ٹھنڈا کریں۔

جیلی شکر بنانے کے لیے شکر کو تین بڑے چمچ پانی میں گھولیں اور سنہرا ہونے تک پکائیں۔

ٹھنڈا کرنے کو رکھ دیں اور ٹھنڈا ہونے کے بعد ٹکڑے کر لیں۔

بغیر بھرے ہوئے کیک دو مہینے تک فریج میں رکھے جا سکتے ہیں۔

ٹھنڈا کرنے کے لیے چار یا پانچ گھنٹے درکار ہیں۔

## نان خطائی

**اجزا:** میدہ ایک کپ، نمک ایک چٹکی

بیکنگ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ

چینی آدھا کپ

الائچی تین سے چار عدد

گھی ایک چوتھائی کپ

پستہ موٹا کٹا ہوا حسب ضرورت

**بنانے کی ترکیب**

ایک سو اسی 180 سینٹی گریڈ پر اوون گرم کر لیں۔

الائچی باریک پیس لیں۔

میدہ، نمک، بیکنگ پاؤڈر، چینی اور الائچی کو چھان کر مکس کر لیں اور گھی ملا کر گوندھ لیں۔

پندرہ سے بیس منٹ بعد اس کے قدرے موٹے پیڑے بنا کر اس پر پستہ دبا کر لگا دیں۔

گرم اوون پر تقریباً بیس منٹ تک بیک کریں۔

کرسپی نان خطائی تیار ہے۔

**(بحوالہ: میٹھا دستر خوان، آذین غوث، مکتبہ امام اعظم دہلی، سنہ اشاعت 2019)**

شکیل احمد

# کھانا پکانے سے متعلق ضروری باتیں

کھانا پکانا ایک فن ہے۔ ہمارے گھروں میں عموماً اس ہنر کی تعلیم نہیں دی جاتی اور کھانا پکانے والا اپنی نادانی سے غذا کے کئی مفید اجزا ضائع کر دیتے ہیں۔ کھانا ایسا پکانا چاہیے جو محرک اشتہا، لذیذ اور غذائیت سے پر ہو۔ اس کا اثر گھر والوں کی صحت، ہمت اور اخلاق پڑ پڑتا ہے۔ دوسرے کاموں کی طرح کھانا تیار کرنا ایک مکمل عمل ہے۔ لیکن اگر تدبیر سے کریں تو بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کھانا پکانا شروع کرنے سے پہلے تمام ضروری چیزیں اور برتن مہیا کر لینا چاہیے۔ درمیان میں سامان لینے جانے سے پریشانی ہوتی ہے۔

کچھ غذائیں ہم کچی استعمال کرتے ہیں اور کچھ پکا کر کھاتے ہیں۔ دنوں ہی طرح کی غذاؤں کو پہلے صاف کر لینا چاہیے۔ پکانے سے اکثر غذاؤں میں موجود جراثیم ختم ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی جراثیم باقی بھی رہ سکتے ہیں اس لیے شروع میں ان کا دھونا اور صاف کرنا ضروری ہے۔ سبزیوں اور پھلوں کو صاف پانی سے مل کر دھونے سے ان کی سطح پر چپکے جراثیم نکل جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ پانی میں تھوڑا پوٹاسیم پرمینگنیٹ ڈال لیں بعد میں صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ جڑوں والی اور ہرے پتوں کی سبزیوں کو خاص طور سے صاف کر کے دھونا چاہیے۔ سبزی یا پھل بہت دیر تک پانی میں بھگو کر نہیں رکھنا چاہیے ایسا کرنے سے پانی میں حل ہونے والے بہت سے مفید اجزا جیسے وٹامن اور معدنیات وغیرہ گھل کر نکل جاتے اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ مریضوں کو دی جانے والی پرہیزی غذاؤں کی صفائی پر خصوصی توجہ دینا چاہیے کیونکہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مریض کے اندر جراثیم سے مدافعت کی صلاحیت اور طاقت بہت کم ہو جاتی ہے۔

کھانا پکانا شروع کرنے اور سبزی کاٹنے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح دھو لینا چاہیے ہاتھ کے ناخن کٹے ہونے چاہیے۔ کھانسی اور نزلہ کی حالت میں کھانا پکانے میں پرہیز کرنا چاہیے۔ چھینک آتے وقت ناک اور منہ پر کوئی رومال ضرور رکھ لیں۔ اگر ہاتھ میں کوئی زخم ہو تو اس پر پٹی ضرور باندھ لینا چاہیے۔ کھلے زخم پر جراثیم جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو سبزی اور سلاد کاٹتے وقت ہاتھ پر دستانے پہن لینا چاہیے۔

### سبزیوں کو خریدنا، رکھنا اور پکانا

بہتر ہے کہ اپنے استعمال کے لیے ہم خود گھر کے قریب سبزی بوئیں۔ اس سے روزانہ ضرورت کے وقت تازی سبزی مل جائے گی۔ لیکن عموماً یہ بات ممکن نہیں ہو پاتی اور خصوصاً شہروں میں تو بہت مشکل ہے اس لیے بازار سے تازی اور اچھی سبزی خریدنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ باسی اور سوکھی سبزیاں اپنی غذائیت کا بہت سا جز پہلے ہی کھو چکی ہوتی ہیں۔ سبزی کاٹنے کے بعد دھوپ میں رکھتے ہیں اس کی کیروٹین۔ وٹامن سی اور وٹامن بی کا بیشتر حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر سائے دار جگہ میں بھی اوسط درجہ حرارت پر پالک یا بھتوا رکھ دیں تو دو دن کے اندر اس کا 80 فیصدی وٹامن

سی ختم ہو جاتا ہے۔ پانی کے خشک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وٹامن بھی ضائع ہوتا جاتا ہے۔ سبزیوں کو رکھنے کی جگہ ریفریجریٹر ہے جہاں اس کو ٹھیک سے لپیٹ کر 39 سے 45° کے درمیان رکھنا چاہیے۔

سبزیوں کی صفائی کرنے میں بہت سے ضروری اجزا ضائع نہ ہو جائیں اس لیے ان اجزا کو بچانے کے لیے حتی الامکان کوئی بھی جز بلا ضرورت کاٹ کر الگ نہیں کرنا چاہیے جیسے پھول گوبھی اور گانٹھ گوبھی کے نرم پتے جن میں قیمتی اجزا خصوصاً کیروٹین ہوتے ہیں استعمال کر لینا چاہیے۔ کاہو کے باہری ہرے پتوں میں کیروٹین اور اچھی پروٹین اندر کے زرد حصہ کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے۔ لیموں کے عرق اور سرکہ میں سٹرک ایسڈ ہوتا ہے جو جراثیم کو ختم کرتا ہے۔ اگر ان کو کھانے کے ساتھ چٹنی یا اچار میں ملا کر کھائیں تو بہت مفید ہے۔ پیاز اور لہسن بھی دافع جراثیم ہیں۔ اس لیے سلاد میں کئی چیزیں ملا کر استعمال کی جاتی ہیں۔

پھلوں کو کھانے سے پہلے دھو لینا چاہیے۔ عموماً پھلوں کو نل کے صاف پانی سے دھو لینے سے جراثیم نکل جاتے ہیں۔ بیریز (رس دار چھوٹے بیج والے پھل) باریک چھلنی میں رکھ کر اوپر سے دو یا تین بار پانی ڈال کر دھونا چاہیے۔ پھل دیکھنے میں صاف اور سوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی سطح پر بہت سے جراثیم چپکے ہوتے ہیں۔

**سبزی کاٹنا اور سلاد تیار کرنا**

سبزی تیار کرنے میں چار باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ (1) سبزی تازی ہو۔ بہتر ہے استعمال کرتے وقت ہی پودے سے توڑی جائے۔ (2) اچھے قسم کی ہو۔ کسی طرح کا کیڑا وغیرہ نہ لگا ہو۔ مکمل طور پر مرکب کھاد میں تیار ہوئی ہو۔ سڑی اور سوکھی نہ ہو۔ خصوصاً مریضوں کی خوراک کے لیے تو بہت اعلیٰ قسم کی سبزی ہونا چاہیے۔ (3) صفائی کے بارے میں ہدایات پر عمل کیا جائے تا کہ سبزی کے کیڑوں، جراثیم اور کوئی بیلائی بیکٹیریا سے پھیلنے والے امراض سے آدمی بچا رہے۔ (4) کئی سبزیوں کو ملا کر سلاد بنایا جائے تا کہ ہر طرح کی غذائیت اور ضروری اجزا حاصل ہو جائیں، مثلاً سلاد میں پیاز، ٹماٹر کھیرا مولی، ککڑی، گاجر چقندر، شلجم، ہری مرچ، ہری پتیاں اور لیمو شامل کیے جائیں۔ بہتر ہے کہ ایک وقت کی سلاد میں لیمو کے ساتھ کوئی تین سبزیاں شامل ہوں۔ دوسرے وقت دوسری تین اس طرح بدل بدل کر استعمال کرنے سے ذائقہ بہتر، خوش رنگ اور مفید اجزا مل جاتے ہیں۔

مختلف سبزیوں کے دھونے اور کاٹنے کے طریقے الگ ہیں۔ پتوں والی سبزیوں مثلاً کرم کلا، برگ کاہو، برگ کاسنی۔ گوبھی کے پتوں کو الگ کر کے خشک اور سڑے پتوں کو نکال دینا چاہیے۔ ہرے پتوں کو الگ الگ ہلکے نمک کے پانی سے دھونا چاہیے۔ بعد میں صاف پانی سے دھو کر لوہے کی جالی یا کپڑے میں رکھ کر اس کا پانی نچوڑنا چاہیے۔ چھوٹی پتیوں والی سبزیاں جیسے پالک، بتھوا، کلرونداِ، جار اور کونپل وغیرہ کے سخت ڈنٹھل اور جڑیں نکال کر نمک کے پانی میں بھگو دینا چاہیے بعد میں خوب دھو ڈالنا چاہیے۔

جڑ والی سبزیوں جیسے گاجر، چقندر، شلجم، مولی، گانٹھ گوبھی، اجمود، زمین قند کو بہتے پانی کے نیچے رکھ کر برش سے رگڑ کر دھو ڈالنا چاہیے۔ پھر کاٹ کر نمک اور لیمو کے پانی میں ڈال دینا چاہیے تا کہ تازگی باقی رہے۔

بیج والی سبزیوں جیسے ٹماٹر، کھیرا، ککڑی، کدو، ہری مرچ وغیرہ کو دھو کر اگر ضرورت ہو تو چھیل کر چھوٹے ٹکڑے کر لینا چاہیے۔ کھیرے کو درمیان سے سروں کی طرف چھیلنا چاہیے پھر کڑوے سروں کو کاٹ کر نکال دینا چاہیے۔ نرم کھیرے اور ککڑی کو چھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سبزیوں کو کاٹ کر نمک اور لیمو کے پانی میں بھگو دینے سے مضر جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ بعد میں بہتے صاف پانی سے جالی میں رکھ کر دھو دینا چاہیے اس سے وہ بالکل صاف ہو جائیں گی۔ جراثیم وغیرہ سبزی اور پھلوں کے باہری سطح پر ہوتے ہیں اندرونی حصہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ جڑوں والی سبزیوں کو جالی دار برتن میں رکھ کر ابلتے پانی میں ایک غوطہ دینے سے بھی جراثیم نکل جاتے ہیں اور سبزی بالکل محفوظ رہتی ہے۔

سبزیوں اور پھلوں کے عرق جراثیم سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ عرق میں تھوڑا سا لیموں کا عرق بھی شامل کر دیا جائے۔

ایسا سے پیدا ہونے والے متعدی مرض سے بچنے کے لیے سبزیوں کو چونے کے پانی اور کلورائڈ میں ڈبو دینا چاہیے پھر ابلتے پانی سے دھو لینا چاہیے تا کہ چونا نکل جائے۔

**(ماخوذ: ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، تیسری طباعت 2010)**

## حسن کی نگہداشت

# جلد کا پگمنٹیشن

### پگمنٹیشن اور اس کا علاج

لوگوں کو اکثر جلد سے متعلق مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان میں سے ایک مسئلہ جلد کی رنگت کا ہے۔ پگمنٹیشن کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ پگمنٹیشن کیا ہے، یہ کیوں ہوتا ہے اور اس کی کتنی اقسام ہیں، اس کا علاج کیسے کیا جاتا ہے۔

ہر کوئی خوبصورت نظر آنا چاہتا ہے۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی جلد ہمیشہ چمکتی رہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔لوگوں کو اکثر جلد سے متعلق مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان میں سے ایک مسئلہ جلد کی رنگت کا ہے۔ پگمنٹیشن کیا ہے، یہ کیوں ہوتا ہے اور جلد کی رنگت کی کتنی اقسام ہیں۔اس کا علاج کیسے ممکن ہے؟

### پگمنٹیشن کیا ہے؟

جلد پر سیاہ دھبوں اور کچھ جگہوں سے جلد کا رنگ گہرا ہو جانا پگمنٹیشن کہلاتا ہے۔اسے ہائپر پگمنٹیشن بھی کہا جاتا ہے۔ کسی کے چہرے پر اس کے نشان چھوٹے ہوتے ہیں تو کسی کے بہت بڑے۔ اگرچہ، یہ نقصان دہ نہیں ہے، لیکن بعض صورتوں میں یہ طبی مسئلے کی علامت بھی ہوسکتی ہے۔اس سے جلد غیر صحت مند دکھائی دیتی ہے۔

### پگمنٹیشن کی اقسام کتنی ہیں

یہ دو قسم کا ہوتا ہے، ہائپو پگمنٹیشن اور ہائپر پگمنٹیشن ۔ ہائپر پگمنٹیشن جلد کا ایک عام مسئلہ ہے۔اس میں جلد کے ایک حصے کا رنگ باقی حصوں سے گہرا ہو جاتا ہے۔اس کے ساتھ جلد پر دھبے بھی نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک عام مسئلہ ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ جلد میں میلانین کی سطح کا بڑھ جانا ہے۔

### پی آئی ایچ

PIH اس سے مراد پوسٹ انفلامیٹری ہائپر پگمنٹیشن ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو جلد پر چوٹ لگنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ کئی بار لیزر تھراپی لینے کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔ آج کل مارکیٹ میں دستیاب کاسمیٹکس میں بہت نقصان دہ کیمیکلز ہوتے ہیں۔ ایسی مصنوعات کا استعمال بھی اس مسئلے کی وجہ ہے۔

پگمنٹیشن کی بہت سی وجوہات ہیں، جیسے کہ جینیاتی خصلتیں، سورج کی روشنی میں زیادہ دیر تک رہنا، پیدائش پر قابو پانے والی گولیوں کا استعمال وغیرہ۔ ساتھ ہی اسکن ٹریٹمنٹ اور ہیئر ڈرائر کے بے قاعدہ استعمال کی وجہ سے بھی یہ مسئلہ بڑھ جاتا ہے۔

### کس طرح دفاع کرنا ہے

پگمنٹیشن سے بچنے کا بہترین طریقہ سورج سے دور رہنا ہے۔ دھوپ میں نکلنے سے پہلے سن اسکرین لگائیں۔ 30 ایس پی ایف کے ساتھ اچھی کوالٹی کی سن اسکرین لگائیں۔سورج کی روشنی سے بچنے کے لیے آپ ماما ارتھ الٹرا لائٹ انڈین سن اسکرین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جو خاص طور پر ہندوستانیوں کے لیے ایک بہترین پروڈکٹ ہے۔سورج کی

UVA اور UVB شعاعوں سے 6 گھنٹے تک مسلسل تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس سے جلد خشک نہیں ہوتی بلکہ نرم رہتی ہے۔ یہ سن اسکرین پیرابین، منرل آئل، سلیکون وغیرہ جیسے کیمیکلز سے مکمل طور پر پاک ہے۔ اس کے استعمال سے آپ نہ صرف چہرے پر آنے والی پگمنٹیشن سے بچ سکتے ہیں بلکہ آپ کے چہرے کی چمک بھی برقرار رہے گی۔

**لیزر تھراپی سے علاج کریں**

اگر آپ کریم سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو آپ لیزر ٹیکنالوجی کا بھی سہارا لے سکتے ہیں۔ اس میں کئی سیشن لے کر آپ پگمنٹیشن سے نجات پا سکتے ہیں۔

**بلیمیشس کریم**

Blemishes کریم گل موہر، شہتوت اور وٹامن سی کا مجموعہ ہے۔ اس کا کام ہماری جلد میں میلانین کی پیداوار کو کم کرنا ہے۔ میلانین کی زیادہ پیداوار کی وجہ سے سیاہ دھبوں یا پگمنٹیشن جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ علما ارتھ بائے بائے بلیمیشز کریم جلد میں میلانین کی پیداوار کو کم کر کے پگمنٹیشن کے مسائل کا علاج کرتی ہے۔ جلد کی قدرتی رنگت اور چمک کو بھی برقرار رکھتا ہے۔

پگمنٹیشن کو دور کرنے کے لیے گھریلو علاج آزمائیں۔

**کوکو بٹر**

کوکو مکھن جلد کو نرم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ روغن کو دور کرنے کے لیے اسے دن میں تین بار استعمال کرنا چاہیے۔

**کچا آلو**

پگمنٹیشن سے نجات کے لیے کچے آلو کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کچا آلو ہماری جلد کے لیے غذائیت بخش ہے۔ اس کو چھیل کر جلد پر رگڑنے سے جلد کو آرام ملتا ہے۔

**لیموں اور شہد**

لیموں اور شہد کا امتزاج جلد کو بے داغ بنانے کا ایک بہت ہی موثر طریقہ ہے۔ جہاں لیموں چہرے سے داغ دھبوں کو دور کرنے کا کام کرتا ہے، وہیں شہد جلد کو سخت اور قدرتی غذائیت فراہم کرتا ہے۔ پگمنٹیشن دور کرنے کے لیے لیموں اور شہد کے آمیزے کو چہرے پر 10 منٹ تک لگا رہنے دیں۔

**سیاہ دھبوں کا علاج**

سیاہ دھبوں کو دور کرنے کے لیے ایک چائے کا چمچ صندل پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ گلیسرین اور ایک چائے کا چمچ عرق گلاب لیں۔ ان تمام اجزاء کو ایک پیالے میں مکس کریں۔ سب سے پہلے اپنے چہرے کو دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ اب اس پیسٹ کو آنکھوں اور ہونٹوں کے علاوہ پورے چہرے پر لگائیں۔ پیسٹ کو 20 منٹ تک لگانے کے بعد تقریباً 5 منٹ تک چہرے پر اچھی طرح مساج کریں۔ اب چہرے کو پانی سے دھو لیں۔ آپ یہ گھریلو نسخہ روزانہ آزما سکتے ہیں۔

(بحوالہ: www.thehealthsite.com)

□□□

# تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' نومبر 2022 نظر نواز ہوا۔ اب کے سرورق اس درجہ پُرکشش، رنگین وزیبا ہے کہ سب کی توجہ اپنی جانب سمیٹ لے، سراج

تجھ پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے
کیا صاف گال والے کیا خط و خال والے

یہ تابدار شمارہ درجن بھر اصنافِ سخن سے مزین ہے۔ مشعل (ص 4) میں کئی حقائق کے ساتھ اس صداقت سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مرد مجاہدوں کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں خواتین کا رول اہم رہا ہے۔ ''شخصیت'' (ص 5 تا 8) کے ذیل میں لکھا گیا مقالہ بعنوان صالحہ عابد حسین اقتباسات سے مزین ایک توصیفی مضمون ہے۔ زبان میں پرکاری و سادگی ہے جو واقعات سے میل کھاتی ہے۔ ''نکہت سخن'' (ص 9) شاعرات کے منتخب اشعار میں وہی جذبات رقم کیے گئے جو دل پر گزر گئے۔ بیگم رضیہ حلیم جنگ کا پہلا شعر بہت عمدہ ہے۔ ویسے ہی زاہدہ زیدی کے دونوں اشعار قابل داد ہیں۔ ''جہانِ نسواں'' (ص 10 تا 34) میں کوئی چھ مضامین ہیں جن میں بیشتر شخصیات پر لکھے ہوئے ہیں جن میں محض ثناخوانی کے اور کیا ملے گا۔ البتہ یہ دیکھنا ہے کہ زبان و بیان کس طرز و نہج کی ہے۔ اس لحاظ سے تمام ہی مضامین خوشگوار ہیں۔ ص 22 پر ''طنز و مزاح نگار خواتین'' کو عنوان اور موضوع کے تقاضہ کے مطابق ڈھالا جاتا تو بہت عمدہ مضمون ہوتا۔ ''مسائل نسوان'' (ص 35 تا 39) کے تحت مضمون ''خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم کا نظم'' بڑی محنت و تحقیق سے لکھا ہوا شاندار مضمون ہے۔ قابل مصنف نے اسے حوالہ جات، جدولوں اور خاکوں کی مدد سے مدلل بنادیا ہے۔ ''اعتراف ہنر'' (ص 40 تا 43) میں مصنف رخسانہ جبین کی شاعری کے معترف معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی شاعری میں نسوانی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ ''حسنِ سخن'' (ص 44 تا 45) میں ''نئی صبح'' سے مستقبل میں امکانی صبح کی امیدیں وابستہ ہیں، اسی طرح ص 45 پر دونوں غزلیں نہایت خیال انگیز و پُر بہار ہیں۔ ''افسانہ'' (ص 46 تا 53) میں دو افسانے ہیں۔ ''باورچی خانہ'' (ص 54 تا 55) میں ملذذ ڈِشوں اور ان کا بیان پروسا گیا ہے۔ ''صحت'' (ص 56 تا 59) میں ''جسم انسانی اور ضرورت غذا'' میں جدول کی مدد سے عمر و جنس کے اعتبار سے درکار غذاؤں کا ضروری بیان تفصیل سے درج ہے۔ بس انھیں دھیان میں رکھ کر بوقت ضرورت استعمال کرنا شرط ہے۔ نہایت صحت بخش ثابت ہوگا۔ ''آرائش و زیبائش'' (ص 60، 61) میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ چند اہم نکات پر کاربند رہ کر جلد کی دیکھ بھال کے ذریعہ حسن کی نگہداشت کیسے کی جاسکتی ہے۔ ''تاثرات'' (ص 62) میں سابقہ شمارہ پر محترمہ یاسمین بیگم صاحبہ نے اپنے زرّین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ طئے ہے کہ کوئی عبارت چاہے سادہ ہی کیوں نہ ہو ''خواتین دنیا'' میں جگہ پاکر معجز بیان ہوجاتی ہے۔ فیض ؎

اک سخن اور کہ پھر رنگ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

**مصطفی ندیم خاں غوری**، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

□□□

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## کلیات رشید احمد صدیقی جلد 8 (مضامین)

ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 510

قیمت: 235 روپے

## عہد وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اوّل)

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سید محمد عزیز الدین حسین

دوسری طباعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

## حالی کی نظمیں

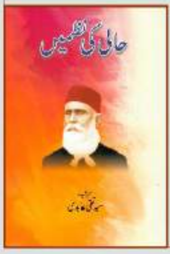


مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 66+262

قیمت: 160 روپے

## کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول)

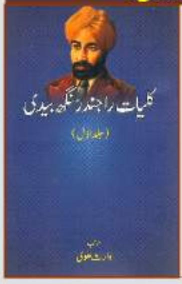


مرتب: وارث علوی

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

## اردو ڈراما: تاریخ وتجزیہ

مصنف: محمد کاظم

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 686

قیمت: 300 روپے

## نظری تنقید: مسائل ومباحث

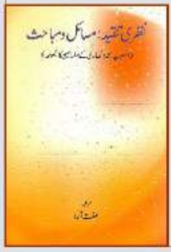


مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

## تشریح البدن (جلد دوم)

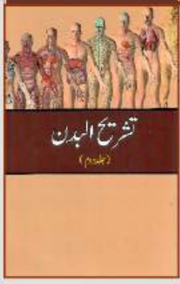


پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

## تاریخ طب یونانی (جلد اول)

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, दिसम्बर-२०२२ वर्ष:६, अंक: १२
Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2022, Vol.6, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-12-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6